جنوری، فروری
1966

المنار

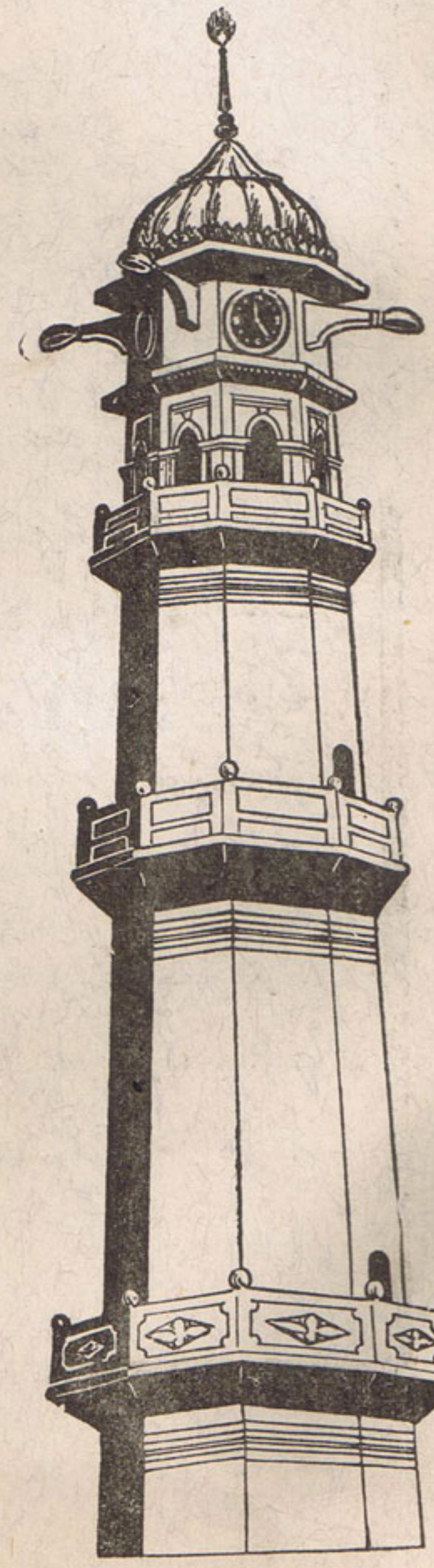

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء میں جماعت احمدیہ کو دو مقدس وجودوں کی جدائی کے غم سے دو چار ہونا پڑا ۔ حضرت سیدہ ام وسیم احمد صاحبہ رضی اللہ عنہا حرم سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالی کی المناک وفات ایک عظیم جماعتی سانحہ تھی ۔ آپ نے کم و بیش ۳۶ سال تک حضور ایدہ اللہ تعالی کی زوجیت میں رہ کر جماعت کی خواتین کی تربیت فرمائی ۔ فجزاھا اللہ خیراً ۔

حضرت سیدہ مرحومہ رض کی وفات پر ابھی چند دن گزرے تھے کہ جماعت کے ایک محبوب ربانی عالم حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی رضی اللہ عنہ بھی اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے ۔ مولانا کی زندگی کا ہر لمحہ اسلام اور احمدیت کی خدمت کے لئے وقف تھا آپ صاحب کشف و الہام اور مستجاب الدعوات روحانی بزرگ تھے ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی دونوں مقدس وجودوں کو اعلی علیین میں جگہ دے اور اجر جزیل سے نوازے ۔ آمین

ادارہ المنار سیدنا حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالی اور جملہ افراد خاندان نیز حضرت مولانا مرحوم کے خاندان اور جملہ افراد جماعت سے ہمدردی اور قلبی تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور مرحومین کے درجات کی بلندی کے لئے دست بدعا ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا مینار

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

مدیران

عطاء المجیب راشد

شمشاد علی سید

مبارک احمد عابد

جلد ۱۳ — جنوری، فروری ۱۹۶۴ء — شمارہ ۲

قلمکار

- محمد ارشد ایم ایس سی
- جمشید ہاشمی
- بشیر افضل جعفری
- ثمامۃ البشریٰ
- مجیب اللہ خان
- سعید انجم
- منظر حسین
- نعیم قدسی
- انعام ہاشمی

اور دوسرے!

(جمشید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا)

قال اللہ تعالیٰ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

درود شریف کی تاکید

محسن اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (الاحزاب : ۵۶)

کہ اللہ تعالیٰ یقیناً اس نبی (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) پر اپنی رحمت نازل کر رہا ہے اور اس کے فرشتے بھی یقیناً اس کے لئے دعائیں کر رہے ہیں۔ پس اے مومنو! تم بھی اس نبی (محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجتے اور ان کے لئے دعائیں کرتے رہا کرو اور (خوب جوش و خروش سے) ان کے لئے سلامتی مانگتے رہا کرو۔

درود شریف کے سلسلہ میں خود میرے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) نے ارشاد فرمایا ہے :-

"مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا ۔ (مسلم)

کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر اسکے بدلہ میں دس مرتبہ اپنی سلامتی نازل فرماتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ ۔ (ترمذی)

کہ اس شخص کی ناک خاک آلود ہو یعنی وہ ذلیل و رسوا ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا اور پھر بھی اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا۔ (ایک دوسری روایت میں درود نہ بھیجنے والے کو بخیل قرار دیا گیا ہے)

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ ایک حدیث درج کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيْهِ .... (ابوداؤد)

کہ جمعہ کا دن تمہارے دنوں میں مبارک اور افضل دن ہے۔ پس اے مسلمانو! اس روز مجھ پر کثرت سے سلام و درود بھیجا کرو۔

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حضور سرور کونین حضرت خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا خاص اہتمام کرے اور اس پر مداومت اختیار کرے کیونکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے قرب کا موجب ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۔

اداریہ

سخنہائے گفتنی

تہذیب و تمدن کے اِس ترقی یافتہ دَور میں، جو آج بھی بڑی سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے، انسانی ذہن ایسے وسائل کو بروئے کار لانے کی فکر میں ہے جن کے ذریعہ ترقی کی معراج تک پہنچنے کا فاصلہ کم سے کم وقت میں طے کیا جا سکے لیکن اِن عجیب و غریب ایجادات اور انکشافات کے جلو میں بعض ایسی روایات نے بھی جنم لیا ہے جن کے متعلق اندیشہ ہے کہ کسی وقت بھی اِس ترقی کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ انسان چاہتا تو یہی ہے کہ اپنے اصل مقصد کو حاصل کرے اور اِس باب میں قدرت کے سربستہ اسرار کی نقاب کشائی کرے لیکن بعض اوقات عمداً یا غیر ارادی طور پر وہ اپنے معیّن دائرہ سے نکل کر دوسروں کے معاملات میں بے جا دخل اندازی شروع کر دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ چپقلش، شکر رنجی اور ہر دو افراد کے فرائض کی ادائیگی میں تعطّل ہوتا ہے۔

طلباء ملک کا بیش قیمت اثاثہ ہوتے ہیں بلکہ اُن کی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے انہیں قوم کی ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہیئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد ملکی فرائض کا بوجھ اُنہی کے کندھوں پر پڑنے والا ہے اور انہی طلبہ کو اپنے اسلاف کی مقدس روایات کی پاسبانی کرنی ہوگی لیکن مقامِ افسوس ہے کہ طلباء زندگی کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے فرائضِ منصبی کو بھولتے جا رہے ہیں۔ حصولِ علم اور سیاست ہماری نگاہ میں دو الگ الگ امور ہیں جن میں بیک وقت صحیح معنوں میں حصّہ نہیں لیا جا سکتا۔ طلبہ کے حالیہ ہنگامے دیکھ کر طلبہ کی کوتاہ بینی پر رونا آتا تھا کہ وہ اِس بات کا فیصلہ کر سکے کہ فی الوقت اُن کے لئے کونسی بات زیادہ اہم ہے، حصولِ علم یا سیاست؟ حصولِ علم ایک مقدّس فریضہ ہے جو ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے اور یہی نہیں بلکہ فرشتے طالبِ علم کے لئے اُس وقت تک اپنی امانت و نصرت کے بازو پھیلائے رکھتے ہیں جب تک وہ حصولِ تعلیم میں مصروف رہتا ہے۔ سیاست کی افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہر کام کرنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر ہر کام ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ سیاست ملک کے نظامِ حکومت کو چلانے کا نام ہے، ظاہر ہے کہ صرف آزمودہ کار اور تجربہ کار افراد ہی اِس عظیم ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور وہ طلبہ جن کے ذہن ابھی ذہن صیقل ہوتے ہیں اور نہ انہوں نے جہانبانی کے طور و اطوار سے آگہی حاصل کی ہے اس حالت میں میدانِ سیاست کے شہسوار نہیں بن سکتے۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ وقت کی نزاکت کو

پہچانیں اور انہی کاموں کو مقدم و افضل سمجھیں جن کا وقت تقاضا کرتا ہے اور دیگر امور کو اُس وقت تک کے لیے اُٹھا رکھے جب تک ان کا مناسب وقت نہ آجائے۔

ہر چند کہ ہم خود طالب علم ہیں اور اِس دَور سے گزر رہے ہیں جسے عوام الناس کی اصطلاح میں خصوصی طور پر طالبعلمی کا زمانہ کہا جاتا ہے اور ہمیں اِس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ شاید ہماری یہ گزارش ہمارے طالب علم بھائیوں کی ناراضگی کا موجب ہو لیکن ہم اِس بات کے اظہار سے رُک نہیں سکتے کہ ہماری دانست میں طلبہ کا ملک کی سیاست میں عملی حصّہ لینا انہیں ہرگز زیب نہیں دیتا۔ طلبا کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر کوششیں حصولِ علم کے لئے صرف کریں اور اِس مقدّس فریضہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ طلبہ کو اپنا مقام پہچاننا چاہیئے اور جس بات کے وہ اہل نہیں اُس میں دخل اندازی کی احمقانہ جسارت ہرگز نہ کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارے طالب علم بھائی اپنے نفسوں کا محاسبہ کریں اور اِس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ کیا ہڑتالوں، احتجاجوں اور دیگر تخریبی کارروائیوں سے وہ ان مقاصد کو پورا کر رہے ہیں جن کی خاطر وہ مادرِ علم سے وابستہ ہوئے ہیں تو شاید انہیں اپنی غلط روی کا احساس ہو جائے۔ طلبا فی الوقت اس تعلیمی اور اخلاقی نقصان کا اندازہ کر سکیں یا نہ کر سکیں لیکن وقت آتا ہے جب وہ دل ہی دل میں شرم و ندامت محسوس کریں گے لیکن اُس وقت اُن کا افسوس اِس عظیم نقصان کی تلافی نہ کر سکیگا۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اگر ہمارے طالب علم بھائیوں نے حصولِ علم کے مقدّس فریضہ کی اہمیت کو نہ سمجھا اور بزرگوں کی مخلصانہ نصائح پر کان نہ دھرا تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے۔ کاش طلبہ میں حصولِ علم کی حقیقی تڑپ پیدا ہو اور وہ اِس کام میں اِس قدر منہمک ہو جائیں کہ بیرونی عوامل ان کی پڑھائی میں خلل انداز نہ ہوں۔ ان میں علم حاصل کرنے کی ایسی لگن پیدا ہو کہ وہ ہر اُس چیز سے نفرت و حقارت کرتے ہوئے مجتنب رہیں جو اُن کے پُرسکون ماحول میں رخنہ انداز ہو کر ان کی توجہ منتشر کرنے کا باعث ہو۔ اگر یہ صورت پیدا ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ طلبہ میں ایسی اعلیٰ علمی اور اخلاقی استعداد پیدا ہوگی کہ وہ خود بھی اپنے آپ پر فخر کر سکیں گے اور اپنے ملک کے لئے بھی سرمایۂ صد افتخار ہوں گے۔

(ع - م - ر)

تبرّکات

ہمارا پیارا رسُولؐ

(کلمات طیّبات سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام)

"ہمارا اعتقاد ہے کہ ہمارے رسول (سیّدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) تمام رسولوں سے بہتر اور سب رسولوں سے افضل اور خاتم النبییّن ہیں اور افضل ہیں ہر ایسے شخص سے جو آئندہ آئے یا جو گزر چکا ہو۔" (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۳۲۲)

"وہ مبارک نبی حضرت خاتم الانبیاء، امام الاصفیاء، ختم المرسلین، فخر النبییّن جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اے پیارے خدا اس پیارے نبیؐ پر وہ رحمت اور دُرود بھیج جو ابتداء دنیا سے تُو نے کسی پر نہ بھیجا ہو۔"

(اتمام الحجۃ صفحہ ۲۸)

"وہ توحید جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اس کو دنیا میں لایا۔ اس نے خدا سے انتہائی درجہ پر محبّت کی اور انتہائی درجہ پر بنی نوع انسان کی ہمدردی میں اس کی جان گداز ہوئی۔ اسلئے خدا نے جو اس کے دل کے راز کا واقف تھا اس کو تمام انبیاء اور تمام اوّلین و آخرین پر فضیلت بخشی اور اس کی مرادیں اس کی زندگی میں اس کو دیں۔ وہی ہے جو سرچشمہ ہر ایک فیض کا ہے اور وہ شخص جو بغیر اقرار افاضہ اس کے کسی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ ذرّیتِ شیطان ہے کیونکہ ہر ایک فضیلت کی کنجی اس کو دی گئی ہے اور ہر ایک نعمت کا خزانہ اس کو عطا کیا گیا ہے۔ جو اس کے ذریعہ سے نہیں پاتا وہ محروم ازلی ہے۔ ہم کیا چیز ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم کافر نعمت ہوں گے اگر اس بات کا اقرار نہ کریں کہ توحید حقیقی ہم نے اسی نبیؐ کے ذریعہ سے پائی۔ اور زندہ خدا کی شناخت ہمیں اس کامل نبیؐ کے ذریعہ سے اور اس کے نور سے ملی ہے اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی جس سے ہم اس کا چہرہ دیکھتے ہیں اسی بزرگ نبی کے ذریعہ سے ہمیں میسّر آیا ہے۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۱۵)

"تمام آدمزادوں کے لئے اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو تم کوشش کرو کہ سچّی محبّت اس جاہ و جلال کے نبیؐ کے ساتھ رکھو اور اس کے غیر کو اس پر کسی نوع کی بڑائی مت دو تا کہ آسمان پر تم نجات یافتہ لکھے جاؤ۔"

(کشتی نوح صفحہ ۲۳)

کلام الامام

(سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام)

پاک و برتر ہے وہ جھوٹوں کا نہیں ہوتا نصیر
ورنہ اُٹھ جائے اماں پھر سچے ہوویں شرمسار

ہے کوئی کاذب جہاں میں لاؤ لوگو کچھ نظیر،
میرے جیسی جس کی تائیدیں ہوئی ہوں بار بار

یہ اگر انساں کا ہوتا کاروبار اے ناقصاں
ایسے کاذب کے لئے کافی تھا وہ پروردگار

کچھ نہ تھی حاجت تمہاری نے تمہارے مکر کی
خود مجھے نابود کرتا وہ جہاں کا شہریار

اس قدر یہ زندگی کیا افترا میں کٹ گئی
پھر عجب تر یہ کہ نصرت کے ہوئے جاری بحار

صاف دل کو کثرتِ اعجاز کی حاجت نہیں
اِک نشاں کافی ہے گر دل میں ہو خوف کردگار

امام الکلام

(سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ)

مُردوں کی طرح باہر نکلو اور ناز و ادا کو رہنے دو
سِل رکھ لو اپنے سینوں پر اور آہ و بکا کو رہنے دو

اب تیرِ نظر کو پھینک کے تم اک خنجرِ آہن ہاتھ میں لو
یہ فولادی پنجوں کے ہیں دن اب دستِ حنا کو رہنے دو

کیا جنگوں سے مومن کو ہے ڈر وہ موت سے کھیلا کرتا ہے
تم اس کے سَر کرنے کے لئے میدانِ وغا کو رہنے دو

مسلم جو خدا کا بندہ تھا افسوس کہ اب یوں کہتا ہے
اسباب کرو کوئی پیدا جبریلؑ و خدا کو رہنے دو

خود کام کو چوپٹ کر کے تم اللہ کے سر منڈھ دیتے ہو
تم اپنے کاموں کو دیکھو اور اُس کی قضا کو رہنے دو

جو اُس کے پیچھے چلتے ہیں ہر قسم کی عزت پاتے ہیں
لگ جاؤ اُسی کی طاعت میں اور چون و چرا کو رہنے دو

اپنی باتیں

● زیرِ نظر شمارہ ۱۹۶۴ء کا پہلا شمارہ ہے ——— ہم نے نئے عزم اور نئے ارادہ کے ساتھ کام کرنے کا وعدہ کیا تھا ہم اس عہد کو کہاں تک پورا کر سکے ہیں اس کا اندازہ آپ اس شمارہ کو پڑھنے کے بعد لگا سکیں گے ہمیں اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمائیے گا!!

● اس شمارہ میں مقالات کا حصہ خاصہ ضخیم ہے ——— ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے طلباء اس طرف توجہ کر رہے ہیں ——— اساتذہ کے بارہ میں کچھ کہنا "سوئے ادب" ہے اسلئے ہم دوبارہ ان سے درخواست کرینگے کہ وہ "اپنے بچوں" کے اس رسالہ کو فراموش نہ فرمائیں۔

● پروفیسر محمد ارشد صاحب کا مقالہ "سورج سے بجلی" شریکِ اشاعت ہے۔ پروفیسر موصوف نے پنجاب یونیورسٹی میں شمسی توانائی کے موضوع پر باقاعدہ تحقیقات کی ہے۔ اس لئے اُن کی رائے بہرحال ایک محقق کی رائے ہے۔ اگلے پرچہ میں انشاء اللہ اس موضوع پر ان کا ضخیم اور مکمل مقالہ شائع کیا جائے گا۔

حمامۃ البشریٰ صاحبہ ایم۔اے عربی کی طالبہ ہیں ان کا مقالہ "اسلام اور تصوف" شریکِ اشاعت ہے۔ اس عنوان پر مزید علمی تحقیق شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!

● اب کے افسانوں کا حصہ بھی کچھ رُو بہ ترقی ہے ——— سعید انجم صاحب کا افسانہ ایک مفلس بچے کے تجزیہ نفس پر مشتمل ہے۔ وہ کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں؟ یہ تو پروفیسر صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب یا آپ ہی فرما سکیں گے ——— ادبی حیثیت سے افسانہ بڑا کامیاب ہے! ہم اس کے لئے انجم صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں ———

مجیب اللہ خان صاحب کی ستھری زبان اور منظر کشی قابلِ داد ہے!

● اب کے کچھ غزلیں بھی شائع ہو رہی ہیں لیکن ہم ان کے معیار سے پوری طرح مطمئن نہیں ——— تمام حضرات سے یہی درخواست ہے کہ ع

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر!

جناب شیر افضل جعفری صاحب ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ بڑھیئے اور لطف اٹھائیے!

نظموں میں نعیم قدسی صاحب کی نظم دورِ حاضر کے ہر انسان کے دل کی آواز ہے جو ایک دوراہے پر کھڑا ہے اور نہیں جانتا کہ کیا ہوگا!

کریم قمر صاحب گویا قدسی صاحب کی الجھن کا جواب پیش کر رہے ہیں!

● المنار کا اگلا شمارہ انشاء اللہ سالنامہ ہوگا۔ ابھی سے توجہ فرمائیے! پرچہ انشاء اللہ مارچ کے چوتھے ہفتہ میں شائع ہوگا!

(مدیران)

مقالات

- جنید ہاشمی
- حمامۃ البشریٰ
- محمد ارشد
- مظہر حسین

جنید ہاشمی

شعر کیا ہے؟

شعر کا لفظ عربی ہے جو "شعور" سے نکلا ہے۔ شعور کے معنی دانش کے ہیں یعنی "جاننا"۔ شعر کیا چیز ہے؟ اس کی تعریف مختلف علما و شعراء نے مختلف بیان کی ہے۔ مغربی لوگ ہر اس کلام کو شعر کہتے ہیں جس میں "شعریت" ہو، خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔ گویا کہ علمائے یورپ کی یہ انتہا پسندی ہے کہ وہ ہر اس "ادب پارہ" کو جس میں حُسن ہو اور اثر ہو شعر کا نام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مشرقی علماء نے کلام کے دو حصے کیے ہیں، ایک کو وہ "نثر" کہتے ہیں اور دوسرے کو "نظم"۔ اور پھر وہ "نظم" جس میں شعریت ہو (یعنی جس میں جذبات ہوں اور حُسن ہو) وہ شعر ہے لیکن عروضیوں نے کہا ہے کہ شعر وہ کلام موزوں ہے جو مقفّیٰ اور بالارادہ ہو۔ ذیل میں ہم مشرقی اور مغربی علماء کی "شعر" کے متعلق آراء درج کرتے ہیں۔ شاید آپ میں سے کوئی صاحب اس کی جامع و مانع تعریف سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

(۱) "شعر وہ کلامِ موزوں ہے جو خیال انگیز اور مؤثر ہو۔" (نصیر الدین طوسیؒ)

(۲) "عروضیوں کے نزدیک شعر کلامِ موزوں کا نام ہے اور منطقیوں کے نزدیک خیال انگیز اور مؤثر کلام کا نام شعر ہے۔" (جاحظ عربی مصنف)

(۳) "شعر کلامِ موزوں کا نام ہے، جو بغیر اجازت دل میں اتر جائے۔" (حسرت موہانی)

؎ شعر دراصل وہی ہے حسرت ۔ سنتے ہی جو دل میں اتر جائے!

(۴) "شعر وہ خوش آئند کلام ہے جسے سن کر ہم محظوظ ہوں، یا متعجب یا متأثر۔" (بوعلی سینا)

(۵) "شاعری ایک صناعت (فن art) ہے کہ جو مقدماتِ موہوم پر مبنی ہے اور جس کے پڑھنے سے بعض خیالات آپ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر بڑی شے کو چھوٹی اور چھوٹی کو بڑی کر کے دکھا سکتا ہے، اسی طرح خوبصورت چیز کو بدنما اور بدصورت کو خوشنما بنا سکتا ہے۔" (نظامی عروضی السمرقندی)

(۶) "شعر ایسا کلام ہے جو موزوں اور مقفّیٰ ہو اور بالارادہ لکھا گیا ہو۔" (ابن رشیق کتاب العمدہ میں)

(۷) "شعر منطق کی وہ قسم ہے جس میں تصدیق کا قائم مقام تخیّل ہوتا ہے اور یہ نفسِ انسان پر انبساط یا انقباض کا اثر ڈالتا ہے۔"

(ابنِ خلدون)

(۸) "شعر ایسا فن ہے جس میں طبیعت، جذبات، روایات (نقالی) اور ذکاوت (تخیّل) کو دخل ہوتا ہے۔" (محیط باب شعر)

(۹) "شاعری ایک مصوری اور نقالی ہے جو جذبات اور احساسات کی تصویر الفاظ میں کھینچتی ہے" (ارسطو)

(۱۰) "شعر وہ کلام موزوں ہے جو ایک حساس آدمی کے قلب سے پیدا ہوتا ہے اور سُننے والے کو متاثر کرتا ہے بلحاظ اِس کے کہ شاعر اسے حسین صورت میں پیش کرتا ہے" (کتاب العمدہ فی صناعۃ الشعر)

مندرجہ بالا مشرقی اربابِ تنقید کے خیالات ہیں۔ مغربی نقادوں نے شعر کے متعلق جو تعریفات کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں مغرب کی بہ نسبت شعری تنقید کو بہت کم ارتقاء نصیب ہوا ہے۔ ذیل میں مغربی نقادوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :-

(۱) "شعر مقفّٰی انشاء ہے۔ یہ ایسا فن ہے جو تعقّل اور تخیّل کی مدد سے انبساط کا پیوند صداقت کے ساتھ لگاتا ہے"
(ڈاکٹر جانسن)

(۲) "شعر انشاء کی وہ نوع ہے جو سائنس کی مدّ مقابل ہے۔ اس کا راست مقصد انبساط ہے نہ کہ صداقت" (کالرج)

(۳) "شعر صداقت اور حُسن اور قدرت کے ساتھ عشق کا اظہار ہے۔ اس کے ادراکات کی توضیح تخیّل کے ذریعہ کی جاتی ہے اور اس کی زبان کا توازن یکسانیت میں اختلاف کے اصول کا تابع ہے" (لے ہنٹ)

(۴) شعر، الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ اس سے تخیّل دھوکا کھا جائے۔ مصوّر رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے اس کو الفاظ کے ذریعہ سرانجام کرنے کی صنعت کا نام شاعری ہے" (میکالے)

(۵) شعر کسی چیز یا کسی واقعہ کا فطری تاثر ہے جو اپنی صفائی کی بدولت جذبات اور تخیّل میں ایک غیر ارادی تحریک برپا کر دیتا ہے اور اسی تحریک کی مطابقت سے اس کے اظہار کی آواز اور طرز میں اُتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتا ہے" (ہیزلٹ)

(۶) "شعر تخیّل کی زبان ہے" (شیلے)

(۷) "شعر انسان اور فطرت کا عکس ہے اور شدید جذبات کا از خود چھلکنا ہے" (وَرڈزورتھ)

(۸) "شاعری تنقیدِ حیات ہے۔ ان اصولوں کے ماتحت جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حُسن کے مقرر کردہ ہیں" (میتھو آرنلڈ)

(۹) "شعر مترنم خیال ہے" (کارلائل)

(۱۰) "شاعری جس کا مظہر الفاظ ہوں، وہ حُسن کی مستحسن پیداوار ہے" (ایڈگر ایلن پو)

(۱۱) "شعر ایسی متوازن اور تخیّلی زبان ہے جو مذاق، اختراع، خیالات، جذبات اور بطونِ انسان کو ظاہر کرتی ہے" (اسٹڈین)

(۱۲) "شاعری مسرّت زا صنعت گری ہے۔ جس میں تخیّلی حقائق مستحسن زبان میں ادا کئے جاتے ہیں" (ڈبلیو۔ جے۔ کار تھوپ)

(۱۳) "شاعری موضوع کے مناسب مستحسن زبان بلکہ بحر میں ان اشیاء کا جو پُر معنی ہوں تخیّلی اور جذباتی اظہار یا ایماء ہے" (گیلے)

(۱۴) "شاعری ادب ہے جو عام طور سے انسان سے گہرا اور اعلیٰ علاقہ رکھتا ہے۔ انسانی دلچسپی کے جُز و کے علاوہ اس میں جمالی دلچسپی بھی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ ان لوگوں میں جن کے تفکّر کا ذریعہ ایسی زبان ہے جس میں شعر لکھا جاتا

ہے رفتہ رفتہ جمالی حُسن کے ایسے نفیس سانچے تیار ہو جاتے ہیں کہ خیالات کو حُسن کا دلآویز رنگ عطا کر کے پڑھنے والوں کے قلوب کو متاثر کر سکتے ہیں۔" (ایم۔ ایچ۔ لڈل)

شعر کی حد بندی میں یہ ناکامی کچھ علماء کے اپنے قصور کا سبب نہیں ہے بلکہ دراصل شعر کی نزاکت کسی تعریف کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن مندرجہ بالا اقتباسات سے شعر کے بنیادی عناصر کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ مثلاً (ا) شعر چونکہ آرٹ ہے اس لئے اس میں زبان اور اسلوب کی نزاکت اور خوبی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ (ب) شاعری بغیر تخیل کے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ (ج) موزونیت جس سے جذبات خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں لیکن وزن کے معنی محدود بحری وزن کے نہیں ہیں۔

موزونیت ایک وجدانی کیفیت ہے جو بعض چیزوں کی ظاہری شکل میں نظر آتی ہے اور بعض کی اندرونی شکل سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ کلام اگرچہ الفاظ کے مجموعے کا نام ہے مگر بولنے میں آوازیں جو زیر و بم پیدا ہوتا ہے وہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ موسیقی کی آوازیں ہیں اور عروضی صفت رکھتی ہیں اور یہی شعریت کی جان ہے۔

موزونیت کی مثالیں

؎ مجھے پینے دے پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے۔ کچھ اور ہے۔ کچھ اور ہے ساقی!

؎ یہ گھر گو چہ میرا ہے تیرا نہیں
مگر پھر بھی تیرا ہے میرا نہیں (سحر البیان)

؎ لختِ دل اور اشکِ تر۔ دونو باہم دونو جدا
دونوں رواں بہ ہمسفر۔ دونو باہم دونو جدا

اِن شعروں میں سوائے موزونیت کے آپ کو کوئی بات نہیں ملے گی۔ حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ اس کا اظہار مختلف آوازوں کی صورت میں کرتے ہیں لیکن انسان پر جب یہ جذبہ تیز ہوتا ہے وہ اسے الفاظ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ کبھی حرکات کے ذریعہ بھی اظہار کرتا ہے۔ گویا اصل شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں جذبات کے کمالِ شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں اس لئے ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا۔ وزن شعر کا ضروری جزو ہے جو راگ کی ایک قسم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب شعر پڑھنے کو انشاد یعنی گانا کہتے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں دیکھئے کتنا ترنم ہے ؎

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری (اقبال)

دوسری چیز ہمارے بزرگوں کے نزدیک شعر میں وزن ہونا ضروری ہے۔ وزن سے مراد **عروضی وزن** ہے اور اس پر جمہور کا اتفاق ہے۔ ہمارے عروضیوں نے اس کے لئے اٹھارہ بحور مقرر کئے ہیں اور شاعری اس کے اندر بند کر دی گئی ہے ؎

؎ نہ خدا ہی ہم سے راضی۔ نہ بُت ہی ہم پہ مائل
رہے یونہی پس ماندہ نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے
(بحرِ رمل مثمن)
(فعلاتن - فاعلاتن - فعلاتن - فاعلاتن)

یا ؎ نہ کھینچ اے شانہ اِن زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا
اسیرِ ناتواں ہے یہ۔ نہ دے زنجیر کو جھٹکا
بحرِ ہزج مثمن مفاعیلن ۸ بار

تیسری چیز ہمارے علماء نے شعر کے لئے **قافیہ** قرار دی ہے۔ اصطلاح میں قافیہ اُن چند حروفِ معین کا نام ہے جو کسی قصیدے، غزل کے مطلع میں یا مثنوی کے اکثر ابیات کے ہر مصرع کے آخر میں مکرر آتا ہے۔ یہ مستقل نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً ؎

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یہاں قافیہ صرف "م" ہے اور "دیکھتے ہیں" ردیف ہے (یعنی بار بار آنے والا) اس کو ردی بھی کہتے ہیں۔ اہلِ عرب اس کے قائل نہیں تھے بلکہ صوت پر چلتے تھے ـــــ بہرحال قافیہ کی بھی کئی طرزیں ہیں۔ مکرر قافیے یعنی دو لفظوں کی تکرار سے بھی قافیہ پیدا کیا جاتا ہے۔ قافیہ نہ صرف صوتی لحاظ سے ہی اثر پیدا کرتا ہے بلکہ معنویت کے لحاظ سے بھی مؤثر ہوتا ہے اور اسے اور اُجاگر کرتا ہے۔ اور یہ ایک لمبا قصہ ہے۔ قافیہ کے لفظی معنے "پیچھے آنے والا" کے ہیں اور اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً قافیہ کے اندر ردیف بھی ہو سکتی ہے :-

؎ عاشقی میں کٹتی ہیں کیا خوب راتیں
دو چار گھڑی رونا۔ دو چار گھڑی باتیں

سنگلاخ زمینوں میں مشکل قافیے باندھنا قابلیت کی بیشک دلیل ہے لیکن شعر کی خوبی نہیں کہی جا سکتی۔ اکبر الہ آبادی اور ظفر علی خاں مشکل قافیے کے لئے مشہور ہیں لیکن جگر مراد آبادی کی غزل "لہرا کے پی گیا" کا قافیہ صوتی لحاظ سے جو اثر پیدا کرتا ہے وہ لاجواب ہے۔ قافیے کا التزام بعض رکاوٹیں بھی پیدا کرتا ہے اسی لئے علمائے یورپ نے اسے سہولت سے اظہار کے منافی قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ بحث ہے، ہمیں صرف یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کی بعض لفظی خوبیاں ہوتی ہیں اور بعض اس کی اندرونی خصوصیات، ان کی چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں۔ شعر کی معنوی خوبیوں میں سے پہلی "خیال کی

اصلیت" ہے۔ یعنی جس چیز سے وہ خیال متعلق ہے اس کا وجود حقیقت میں ہو، یا عقل یا اعتقاد کی رُو سے ممکن ہو یا مان لیا گیا ہو۔ فرضی باتوں سے دل پر اثر ڈالنا بھی شاعری ہے مگر اصلیت میں دلکشی پیدا کرنا شاعری کی معراج ہے :۔

؎ کبھی نہ ہوش میں ہم لے خیالِ یار آئے
کسی کے در پہ گئے جب اسے پکار آئے

اب خیال کی اصلیت ملاحظہ ہو :۔

؎ دل میں اِک اضطراب باقی ہے ÷ یہ نشانِ شباب باقی ہے

؎ کنجِ قفس میں تھی یہ تمنّا۔ قید سے ہوں آزاد کہیں
خوف ہے اب بے بال و پری میں۔ چھوڑ نہ دے صیّاد کہیں

(۲) سادگی :۔ خیال کی سادگی سے مراد یہ ہے کہ کسی قسم کی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہو ؎

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر ÷ دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

(۳) بلندی :۔ خیال رکیک اور عامیانہ نہ ہو، شریفانہ ہو۔ حیوانیت نہ ہو، انسانیت ہو ؎

خوشی جہاں میں بہت ہے ہمارے گھر نہ سہی ÷ ملول کیوں رہیں دنیا کے انتظام سے ہم (اکبر)

(۴) باریکی :۔ خیال سطحی نہ ہو بلکہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور کائنات کے وسیع مشاہدے کا نتیجہ ہو ؎

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی ÷ یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے (غالب)

(۵) تڑپ :۔ خیال کے ساتھ جذبات بھی شامل ہوں ؎

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا ÷ دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا (میر)

یا ؎ گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ÷ رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے (غالب)

اس کے علاوہ شعروں میں لفظی خوبیاں یا صنائع بدائع بھی ضروری ہیں :۔

(ا) سہل ممتنع :۔ سُننے میں جتنا آسان ہوتا ہے کہنے میں اُتنا ہی مشکل ہوتا ہے ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ÷ دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا (میر)

؎ آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے ÷ دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھُلتی ہے نہ برستی ہے (فانی)

(ب) لفظوں کی ترتیب قواعدِ زبان اور اصولِ بیان کے مطابق ہو۔ یعنی اس کی آسانی سے نثر ہو سکے ؎

بتکدے میں شور ہے اگر مسلماں ہو گیا ÷ بیوفاؤں سے کوئی کہدے کہ ہاں ہاں ہو گیا

(ج) مضمون کا کوئی ضروری جُزو چھوٹ نہ جائے۔ شعر میں ایسے لفظ موجود ہوں جو چھوٹے ہوئے جُزو تک ذہن کو پہنچا دیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا۔ مری جو شامت آئے ÷ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

؎ مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ؛ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

(د) **اختصار** :- کم از کم لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا ؛ یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ؛ میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

(س) **زور** :- یعنی مطلب اس طرح بیان کیا جائے کہ جو کیفیت شاعر دکھانا چاہتا ہے اس کا نقشہ پورے طور پر آنکھوں میں پھر جائے ؎

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا ؛ ہوتے جو کئی دیدہ خونابہ فشاں اور! (غالب)

(ص) مناسبتِ الفاظ :- بعض لفظوں کی آواز نرم و نازک ہوتی ہے بعض کی سخت اور کرخت بعض کی شیریں و لطیف بعض کی بھیانک و مہیب ؎

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا ؛ تمہی منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا ؟ (داغ)

ذیل کے شعروں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے لیکن اندازِ بیان مختلف ہے اس لئے اثر میں فرق پیدا ہو گیا ہے ؎

سمجھ رہی ہیں آنکھوں آنکھوں میں مگر سمجھتا ہے ؛ ہمارے منہ سے نہ کہلا کہ آرزو کیا ہے
؎ گراں گزر رہا تھا تو پھر آرزو اس طبعِ نازک پہ ؛ نگاہِ شوق اس مضمونِ رنگیں کو ادا کر دے (حسرت)
؎ ملا کے آنکھ سمجھ لو نہ مدعا پوچھو ؛ وہی ہے دل میں جو حسرت بھری نگاہ میں ہے (آرزو)
؎ فسانۂ جگر و قلبِ خونچکاں سن لو ؛ جو سن سکو تو ہماری بھی داستاں سن لو (صفی)
؎ سرگزشتِ بلاکشاں نہ سنو ؛ نہ سنو میری داستاں نہ سنو

مناسبتِ الفاظ سے مراد یہ ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے ادا کرنے میں زبان رکتی نہ ہو اور کانوں کو ناگوار نہ ہو ؎

دل کی دھڑک سے زخمِ جگر کا دہن جو ٹانکا ٹوٹ گیا ؛ طائرِ جاں جو رشتہ بپا تھا مہلت پا کے چھوٹ گیا (میر)

(ض) **جدت** :- موجودہ مواد کو نئی صورت دینا یا اس سے نیا کام لینا ہر فن میں جدت کہلاتا ہے۔ منتشر خیالات کو کسی خاص ترتیب سے پیش کرے یا دھندلے اور مبہم خیال کو واضح اور روشن کرے اور فرسودہ خیالات کو تازگی کی کیفیت بخشے تو یہ جدت ہو گی۔ مثلاً کہنا یہ ہے کہ عشق کا ذمہ دار عاشق نہیں بلکہ معشوق کا حسن ہے ؎

دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال ؛ ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی (عزیز)

جدتِ ادا کی کئی مثالیں ہیں ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ؛ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

المختصر شعر کی سادہ سی تعریف یہ ہے کہ ایک شاعر زندگی اور کائنات سے خیال حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے مواد فراہم کرتا ہے اور پھر ایک خاص نقطۂ نگاہ سے موزوں الفاظ میں اس کا اظہار کرتا ہے ؛

حمامة البشریٰ
ایم۔اے (عربی)

اسلام اور تصوّف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ہر مسلمان اپنی زندگی قرآن پاک کی اِس آیت کے مطابق بسر کرتا تھا:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

اور بقول حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام:۔

اِنَّ الصَّحَابَۃَ کُلَّھُمْ کَذُکَاءِ ❊ کَانُوْا لِخَیْرِ الرُّسُلِ کَالْاَعْضَاءِ

یعنی صحابہ سب کے سب سورج کی مانند تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ اعضاء کے تھے۔

پس تاریخ اسلام میں ابتداء سے ہی ایسے افراد کثرت سے موجود رہے ہیں جو صفاءِ باطن، عشقِ الٰہی، تقویٰ، خشوع وخضوع، توکل اور فقر میں بڑھے ہوئے تھے اور عبادتِ الٰہی کا خاص ذوق اپنے اندر رکھتے تھے۔ گویا وہ "فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ" کا بہترین نمونہ تھے لیکن یہ سب لوگ صوفی نہیں کہلائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب آپؐ پر نازل ہونے والی وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہوگیا نیز کچھ عرصہ بعد عجمیوں کے آنے کی وجہ سے مذہب میں لاتعداد بدعات پیدا ہونے لگیں تو تاریخ اسلامی میں ایسے لوگوں کا وجود اُبھرا جنہوں نے قرآن پاک کی آیت وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ کے مطابق عام لوگوں میں تقویٰ پیدا کرنے کا عزم صمیم کیا اور انہوں نے اِس مقصد کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ایسے لوگوں میں سے بعض نمایاں ہستیاں صوفیاء یا متصوفین کے ناموں سے موسوم ہونے لگیں۔ پس معلوم ہوا کہ تصوّف نہ تو کوئی نیا مذہب ہے نہ کسی مذہب کا فرقہ بلکہ یہ ایک تحریک ہے۔

تصوّف کی وجہ تسمیہ:۔

صُوفی کے اصل مأخذ کے متعلق حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ "داتا گنج بخش" اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں لکھتے ہیں:۔

"لفظ صُوفی کی تحقیق کے بارہ میں لوگوں نے بہت توجیہات کی ہیں۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ صُوفی کو صُوفی اِس لئے کہتے ہیں کہ وہ صُوف کا کُرتہ پہنتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ صفِ اوّل کے ہونے کے باعث

اُسے صُوفی کہا جاتا ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ اصحاب الصُّفّہ کی تقلید کے باعث صوفی کہلائے کچھ لوگوں نے صُوفی کا اشتقاق صفا سے قرار دیا ہے۔"

اِس کے علاوہ بعض لوگوں نے صوفی کو یونانی لفظ "Sophia" سے بھی مشتق قرار دیا ہے جس کے معنے Wisdom کے ہیں۔ تاہم قرینِ قیاس یہی ہے کہ صُوفی لفظ صُوف سے مأخذ ہے۔ کیونکہ اکثر عیسائی راہب صُوف کے لباس کو اظہارِ انکساری تصور کرتے تھے اور وہ اسے استعمال کرتے تھے اور شروع شروع میں صوفیاء بھی کمبل یا اُون کا لباس استعمال کرتے رہے ہیں۔ اِس کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ فرقد سنجی جو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ایک مرتبہ صوف کا لباس پہنے کھڑے تھے کہ سلمہ فقیہہ نے اُن کو طنزاً یہ کہا تھا کہ "اپنی نصرانیت ترک کر دو۔"

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں صوفی کی تعریف یوں کرتے ہیں :-

"صوفی عقل و دل سے سُنّتِ رسُولؐ کا دلدادہ ہوتا ہے۔"

ابتدائی صوفیاء کے سامنے سُنّتِ رسولؐ پر عمل اور حُبِّ الٰہی وغیرہ ہی ایسے مقاصد تھے جن کی وہ تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اسوقت نہ انہوں نے خلوت نشینی کے لئے خانقاہیں تعمیر کی تھیں اور نہ ہی خرقہ پوشی کا وجود اُس وقت موجود تھا۔ مثالی صوفیاء میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ وغیرہم بیسیوں ائمہ دین شامل تھے۔ اُس وقت اُن کے سامنے تصوّف کے صرف دو رُکن تھے۔ (۱) زُہد (۲) محبّتِ الٰہی

قرآنِ پاک میں زُہد کے بارے میں کثرت سے آیات آئی ہیں جو دنیا سے دُور رہنے اور اُس کی تحقیر پر دلالت کرتی ہیں مثلاً :-

"اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ۔"

یعنی جان لو کہ دنیا کی زندگی تو محض لہو و لعب ہے اور تمہارے درمیان باہمی زینت اور تفاخر اور مال و اولاد میں کثرت کے باہمی مقابلے کا نام ہے۔"

اور حدیث شریف میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

"اَلدُّنْيَا سِجْنٌ لِلْمُؤْمِنِ وَجَنَّةٌ لِلْكَافِرِ۔"

یعنی دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنّت ہے۔"

پھر دنیا سے بے رغبتی کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ۔"

یعنی تُو دنیا میں اِس طرح رہ گویا کہ تُو پردیسی یا راستہ گزرنے والا مسافر ہے۔"

حُبِّ الٰہی تصوّف کا رکنِ ثانی ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے :-

"وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ"

یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں سب سے بڑھ کر ہیں۔"

تصوّف کیا ہے؟ :-

علامہ ابنِ خلدون نے اِس کی سب سے عمدہ تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"اس کی اصل ہے عبادت میں انہماک، انقطاع الی اللہ، دنیا کی زینت سے گریز، لذّتِ مال و جاہ سے اجتناب اور خلق سے کٹ کر عبادت نشینی۔ اور یہ سب باتیں صحابہؓ اور سلف میں عام تھیں۔ پھر جب دوسری صدی میں اور اس کے بعد دنیا کی طرف رغبت عام ہوئی اور لوگ دنیا کی طرف زیادہ مائل ہوئے تو زیادہ عبادت کی طرف میلان رکھنے والے صُوفیاء کے نام سے موسوم ہوئے۔"

پھر وہ کہتے ہیں :-

"ان کے آداب و اصطلاحات کے خاص الفاظ ہیں جو اُن کے درمیان جاری ہیں۔ کیونکہ لُغت میں الفاظ اُنہی معانی کے لئے وضع ہوتے ہیں جو عام طور پہ سمجھے جاتے ہیں لیکن جب ایسے معانی سے سابقہ پڑتا ہے جو عام طور پر سمجھے نہیں جاتے تو ہم اُن کی تعبیر کسی ایسے لفظ سے کر لیتے ہیں جن کا سمجھنا آسان ہوتا ہے ـــــ علمِ شریعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فقہاء اور اہلِ فتویٰ سے مخصوص ہوئی اور دوسری اُن لوگوں کی جو مجاہدہ اور محاسبۂ نفس نیز اس لذّت و راحت میں کلام کرتے ہیں جو اس راہ میں حاصل ہوتی ہے پھر اس کیفیت میں کلام کرتے ہیں جہاں ترقی کر کے ایک ذوق سے دوسرے ذوق کی طرف بڑھتے ہیں پھر اس مجاہدۂ خلوت اور ذکر سے جس کا حجاب اُٹھ جاتا ہے اور اللہ کے حکم سے تمام عوالم کی جنگ ہو جاتی ہے لیکن صاحبِ حس کو قطعاً ان عوالم کا علم نہیں ہوتا اور اس کشف کا سبب یہ ہے کہ جب رُوح حسِّ ظاہر سے لَوٹ کر حسِّ باطن کی طرف جاتی ہے تو حس کے احوال ضعیف ہو جاتے ہیں اور رُوح کے احوال قوی اور رُوح کا حکم غالب آجاتا ہے اور وہ برابر بڑھتی رہتی ہے حتّٰی کہ سراپا دید بن جاتی ہے اور ان چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے جن کا وہ پہلے صرف علم رکھتی تھی۔"

پھر علامہ ابن خلدون نے تصوّف کے چار عناصر بیان کئے ہیں :-

(۱) مجاہدات اور ان چیزوں پر کلام جو اعمالِ نفس کے محاسبہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

(۲) کشف اور اس حقیقت پر کلام جو عالمِ غیب سے حاصل ہوتی ہے۔

(۳) عالَم اور اکوان میں تصرّفات اور انواعِ کرامات۔

(۴) وہ الفاظ جو بظاہر شک میں ڈالتے ہیں لیکن ائمہ صوفیاء کی زبان پر اکثر آتے ہیں اُن کو شطحات کہتے ہیں۔ ان کا ظاہر مشکل ہوتا ہے اس لئے بعض اُن کی تنکیر اور بعض تاویل کرتے ہیں۔

تصوّف کی اصل:۔

اکثر مستشرقین کا خیال ہے کہ تصوّف ایک خارجی عنصر ہے جو اسلام کے بطن میں داخل ہوگیا اور اُس نے اسلام کی اصل صورت بگاڑ دی ہے اور اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ابتداء میں تو صرف قرآن پاک اور سُنّتِ نبویؐ کے مطابق اپنے تزکیۂ نفس میں مشغول ہونے والے اور راہِ سلوک کی منازل طے کرنے والے اور لوگوں کو اِس راہ کی طرف دعوت دینے والے صوفیاء کہلائے ـــــ پس حقیقی تصوّف خالص اور خالص اسلام ہے اور اِس کے سوا کچھ نہیں لیکن بعد میں اِن صوفیاء کے بعض جانشین جادۂ مستقیمِ نبوی سے ہٹ جاتے رہے اور بعض خارجی عناصر کے اثرات کے تحت اپنے طریقوں میں بعض نئے امور داخل کرتے رہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے تصوّف کو بدنام کیا ورنہ تصوّف دراصل قرآن حکیم کے احکام کے ماتحت اپنی رُوح کو صیقل کرنے اور باطنی کمالات کے حصول اور فنا فی اللہ ہونے کا نام تھا۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا"

یعنی لوگ تجھ سے رُوح (اور اُس کے کمالات) کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تو اُنہیں کہدے کہ رُوحِ کامل (جو اللہ تعالیٰ سے اتّصالِ تام کر لیتی ہے) وہ میرے رب کے خاص حکم اور اذن سے ہی تیار ہوتی ہے اور اِس سلوک کی راہوں کو میرا رب ہی متعیّن کر سکتا ہے تمہیں اِس بارہ میں کوئی علم نہیں دیا گیا۔"

اکابر صوفیاء نے قرآن کریم، احادیثِ نبویؐ اور صحابہؓ و تابعین سے کثرت سے عبارات اور اقوال نقل کئے ہیں جن سے وہ اپنے مسلک کی تلاش کرتے ہوئے بہت دُور نکل گئے ہیں۔

تصوّف پر خارجی عناصر کا اثر:۔

تصوّف کے ابتدائی دَور یعنی پہلی دو صدیوں میں خارجی اثرات کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا بلکہ تصوّف خالص اسلام کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اصحابِ صُفّہ کی سادگی حسن بصریؒ کا زُہد بن جاتی ہے اور بلال و صُہیب کا عشق رابعہ بصری کی محبّتِ الٰہی بن جاتی ہے۔

اسی طرح ابراہیم بن ادھمؒ، داؤد طائیؒ، فضیلؒ بن عیاض اور شقیق بلخیؒ سب کے سب دوسری صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ یہ سب مشہور اسلامی صوفیاء تھے ـــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں قریباً سب لوگ ایک ہی رنگ (صبغۃ اللہ)

میں رنگین نظر آتے ہیں۔ اِسی لئے انہوں نے کوئی خاص اصطلاحی نام (سوائے صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) اختیار نہیں کیا۔ بعد میں جب مادیت نے معاشرۂ اسلامی میں دراخل کیا تو وہ لوگ جو مغزِ اسلام کو چمٹے رہے اور اِس دائرے میں نمایاں نظر آئے وہ متصوّفین اولیاء اللہ، اقطاب و ابدال کے القاب سے ملقّب ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ تصوّف پر مختلف خارجی عناصر کا اثر بھی پڑا ہے خصوصاً نصرانیت، بدھ مت اور افلاطونیتِ جدیدہ (Neo - Platonism) لیکن حقیقت یہی ہے کہ خارجی اثرات نے صوفیاء کی اصطلاحات پر شاید کوئی اثر ڈالا ہو ورنہ حقیقت کے اعتبار سے صوفیاء اور اولیاء نے سب کچھ قرآن کریم سے ہی لیا۔ خود قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ "فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" کہ پہلے مذاہب کی تمام اعلیٰ اور قائم رہنے والی تعالیم اِس میں موجود ہیں۔ پس اگر تصوّف میں ہمیں دوسرے مذاہب سے ملتی جلتی بعض چیزیں ملتی ہیں اور ان کا استدلال قرآن کریم کے الفاظ سے بھی ہوتا ہے تو یہ کیوں کہا جائے کہ وہ خارجی اثرات کی وجہ سے ہیں، یہ کیوں نہ کہا جائے کہ وہ قرآن کریم سے ہی اخذ کی گئی ہیں۔

بہرحال بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خارجی اثرات کا تصوّف اور صوفیاء پر اثر پڑا ہے۔ مثلاً دوسری صدی ہجری میں بایزید بسطامیؒ بدھ مت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ فارسی نژاد تھے، انہوں نے اسلامی تصوّف میں فنا کے نظریے کو عام کیا۔ صوفیاء کے نزدیک یہ نظریہ خاص اہمیت رکھتا ہے مظہرِ اوّل رُوح کا اخلاقی تغیّر ہے جس سے شہوات ختم ہو جاتی ہیں ثانی یہ کہ ذہن فکرِ الٰہی میں لگ جائے اور ثالث یہ کہ بغیر ارادے کے اللہ کی یاد میں مشغول رہے اور رابع یہ کہ خدا تعالیٰ کی حمد میں نفس کو اتنا مدغم کرے کہ بقائے دوام حاصل ہو جائے تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت میں بھی یہی درجات تھے اور صوفیاء کے رُوحانی ارتقاء پر اس کا اثر پڑا۔

نصرانیت نے بھی تصوّف پر گہرا اثر ڈالا۔ شام اور عراق میں نصرانی خانقاہیں کثرت سے موجود تھیں مسلمان اُن راہبوں سے ملتے جلتے رہتے تھے اور انجیل کی حکایات نقل کرتے تھے۔ اور یہ نصرانی صوف کا لباس پہنتے اور سخت قسم کی ریاضات میں مشغول رہتے۔ چنانچہ صوف کا لباس بھی انہی راہبوں سے صوفیاء نے نقل کیا۔

اِن دونوں سے بڑھ کر اسلامی تصوّف پر افلاطونیتِ جدیدہ کا اثر پڑا۔ اس کی بہت سی کتب سُریانی میں تھیں جو بعد ازاں عربی میں ترجمہ کی گئیں "افلاطونیتِ جدیدہ" افلوطین مصری کی طرف منسوب ہیں۔ یہ تیسری صدی عیسوی میں مصر میں پیدا ہوا یہاں کے علوم سے فارغ ہو کر روما گیا اور پھر یونانی فلسفہ کی تکمیل کر کے آیا اور الٰہیات پر ایک جامع کتاب لکھی جو بعد میں عربی میں ترجمہ ہوئی۔ کندی نے اس کی اصلاح کی، ابن سینا نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کی شرح لکھی۔ اِس کتاب میں افلوطین لکھتا ہے کہ:۔

"اکثر میری رُوح تخلیے میں ہو جاتی ہے۔ میں اپنے جسم کو ایک طرف چھوڑ دیتا ہوں۔ پھر تمام اشیاء سے الگ ہو کر اس میں لوٹتا ہوں اور خود ہی عالم، معلوم اور علم ہو جاتا ہوں۔ پھر میں اپنی ذات میں عجیب حُسن

اور نُور دیکھتا ہوں جب تک یوں محوِ تماشا ہوتا ہوں۔"

یہی وہ فلسفہ تھا جسے تیسری صدی ہجری میں ذوالنون مصریؒ نے سیکھا تھا اور تجلّی وغیرہ کے تصوّرات اسی راہ سے تصوّف میں داخل ہوئے تھے۔ اور اس صدی کے مشہور صُوفیاء ذوالنون مصریؒ، ابن سلیمان دارانیؒ اور کرخی تھے اور ان سب پر فلسفے کا رنگ بہت غالب تھا۔

کہتے ہیں کہ صوفیا کے احوال کے موجد ذوالنونؒ تھے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ اللہ سے وصال کا راستہ مشکل ہے اس لئے انسان کو چاہیئے کہ بتدریج قدم بڑھائے اور ہر مرحلے پر خاص اہتمام کرے ان مراحل کو وہ مقامات کہتے ہیں۔ طوسی نے کتاب اللّمع میں ان کی تعداد سات بتائی ہے۔ (۱) مقامِ توبہ (۲) ورع (۳) زہد (۴) فقر (۵) صبر (۶) توکّل (۷) رضا

ان کے علاوہ صوفیاء کے احوال یہ ہیں :-

(۱) تامّل (۲) قرب (۳) محبّت (۴) خوف (۵) رجاء (۶) شوق (۷) انس (۸) اطمینان۔

(۹) مشاہدہ (۱۰) یقین۔

تصوّف کا سب سے مشہور عقیدہ وحدت الوجود ہے۔ یعنی محبّ کا محبوب میں فنا ہوجانا یا دوسرے الفاظ میں

مَن تو شدم تو من شدم ؛ مَن تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں ؛ مَن دیگرم تو دیگری

سِلسلۂ صُوفیاء :-

اسلام میں تصوّف کی رسمی تحریک زہد سے شروع ہوئی ابتداء میں صرف چند افراد تک محدود تھی لیکن دوسری صدی ہجری کے وسط میں تصوّف کے نظریے اور اس کے اعمال دونوں میں خاص ترقی ہوئی۔ بڑے بڑے مشائخ نے اپنے گرد درس کے حلقے قائم کئے۔ پانچویں صدی ہجری میں حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس وقت تصوّف کے متعدد مذاہب موجود تھے اور شیخ و مرید کے ادارے قائم ہو چکے تھے اور رباط اور خانقاہوں کی بنیاد پڑ چکی تھی جہاں شیخ اور شاگرد باہم مجاہدے کرتے جب کوئی حلقہ صوفیاء میں داخل ہوتا تو اُسے ایک خرقہ عطا کیا جاتا جو خدمتِ الٰہی کا نشان ہوتا۔

صوفیا کہتے ہیں کہ پہلا خرقہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو عطا کیا تھا وہ تو اب موجود نہیں لیکن ہم ان کی نقل کرتے ہیں لیکن خانقاہی زندگی کے ساتھ تجرّد کا ہونا ضروری نہ تھا کیونکہ نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے :-

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ

لیکن صوفیا کے حلقوں کی باقاعدہ تنظیم چھٹی صدی ہجری سے شروع ہوئی اور اس تنظیم کو طریقت کہتے ہیں۔ خانقاہوں میں ایک شیخ ہوتا اور باقی اس کے مرید تمام اطراف میں پھیلے ہوتے۔ اِس سلسلہ کی خانقاہیں ہر جگہ ہوتیں جہاں ایک ہی طرح کے

آداب و اعمال برتے جاتے۔

سب سے پہلا سلسلہ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کیا۔ جب یہ فوت ہو گئے تو اُن کے مرید اپنے آپ کو قادری کہلانے لگے۔ دوسرا مشہور حلقہ سُہروردیہ کہلاتا ہے۔ اس کے بانی حضرت شہاب عمر بن عبداللہ السہروردیؒ ہیں۔ ان کے مریدوں میں فارسی کے مشہور شاعر 'سعدی' بھی گزرے ہیں۔ تیسرا سلسلہ مغرب میں نورالدین احمد بن عبداللہ الشاذلیؒ المتوفی ۶۳۶ھ نے قائم کیا۔ ان کا وطن تیونس تھا۔ ان کا سلسلہ شاذلیہ کہلاتا ہے۔ چوتھا حلقہ مولانا جلال الدین رومیؒ المتوفی ۶۷۲ھ نے قائم کیا، اس کو مولویہ کہتے ہیں۔ دولتِ عثمانیہ میں اسے بہت رسوخ حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ نقشبندیہ، چشتیہ وغیرہ سلسلے قائم ہوئے، ان میں سے اکثر موجود ہیں اور باقی تقریباً سب کا نظام ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہر دور میں ہر سلسلے کا ایک شیخ اعظم ہوتا ہے جسے خلیفہ کہتے ہیں۔ دوسرے تمام افراد اس کے تابع ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ ان کی خانقاہیں ہوتی ہیں۔ جہاں مستقل طور پر صوفیاء عبادت کرتے ہیں اور ہر حلقے میں مرید ہوتے ہیں جو اُن کی مجالس میں شریک ہو کر تزکیۂ نفوس کرتے ہیں۔ اِن سلسلوں کے لوگ آج بھی دنیا میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

جس طرح ادیانِ حقہ سب کے سب انبیاء کرام سے شروع ہوئے ہیں لیکن بعد میں لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی شکلیں بگاڑ دیں۔ اِسی طرح صوفیاء و اولیاء کے طریقے بھی اُن کے بعد انسانی ہاتھوں میں بدلتے چلے گئے اور اُنہیں بگاڑ دیا گیا حتّٰی کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا سماں نظر آنے لگا۔

اب پھر وہ زمانہ ہے جبکہ اللہ تعالےٰ نے صُوفیاء و اولیاء کے تمام طریقے ختم کر کے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کو از سرِ نو قائم فرمایا ہے۔ یہ زمانہ آنحضرتؐ کی بعثتِ ثانیہ کا زمانہ ہے جیسا کہ قرآن پاک کی آیت کریمہ "وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ" سے ظاہر ہے۔ صوفیاء کاملین و اولیاء عظام کے تمام طریقے جو اپنے اندر قرآن کریم کی سند و تائید رکھتے ہیں اب اِس خلافت علیٰ منہاجِ نبوت میں مدغم ہو چکے ہیں۔ جو طریقہ بھی اِس سے باہر ہے وہ اب صراطِ مستقیم نہیں کہلا سکتا کیونکہ اب اللہ تعالیٰ نے صوفیاء و ائمہ روحانی کے الگ الگ چھوٹے چھوٹے محدود الزمان اور مختص المکان حلقوں کو ختم کر کے عالمگیر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کو قائم فرمایا ہے اور عالمگیر خلافت راشدہ حقہ کے قیام کے بعد تمام فرشتہ سیرت انسانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ" کا نمونہ دکھائیں اور امامِ وقت کے ساتھ مل کر اسلام کی روحانی جنگ لڑیں تا جلد وہ دن آئے کہ ہم "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کا نظارہ رُوئے زمین کے چپے چپے پر مشاہدہ کر لیں اور دنیا میں پھر ایک ہی دین ہو اور ایک ہی پیشوا۔ ایک روحانی نظامِ نو کی تعمیر ہو، بالکل ایسی جیسے آج سے تیرہ سَو سال پہلے ہوئی تھی۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ وقد اوحى الله الى المسيح الموعود عليه السلام اَرَدْتُ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ فَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ؕ

محمد ارشد (ایم۔ایس۔سی)
(اولڈ بوائے)

سورج سے بجلی

انسان کے اکثر کام سورج ہی کے ذریعہ انجام پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً سورج کی گرمی دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے۔ یہ بخارات بارش کی شکل میں پہاڑوں اور میدانوں پر نمودار ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں دریا، ندی نالے اور جھیلیں پیدا ہوتی ہیں جن پر انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کا مدار ہے۔ پھر دریاؤں پر بند باندھ کر بجلی پیدا کی جاتی اور خشک زمینوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔

سورج کی گرمی ہی ہوا کو گرم کر کے اسے چلاتی اور چلائے رکھتی ہے۔ اسی طرح سمندر کی لہریں پیدا ہوتی ہیں اور یہی گرمی اور روشنی پودوں کی خوراک ہے جس سے وہ نشو و نما پاتے ہیں حتیٰ کہ زمین سے نکلنے والی معدنیات از قسم پٹرول، کوئلہ وغیرہ بھی شمسی توانائی کی ہی بدولت معرضِ وجود میں آتی ہیں ..... اور ان سب سے بڑھ کر انسانی زندگی براہِ راست بھی سورج کی غیر موجودگی میں شدید سردی کی وجہ سے ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ وعلیٰ ھٰذا القیاس۔

چنانچہ انسان ایک عرصہ سے اس کوشش میں سرگرداں ہے کہ وہ دنیا کے جملہ کام سورج کی گرمی اور روشنی سے براہِ راست سرانجام دے۔ لیکن اس سلسلہ میں کسی مربوط سائنسی تحقیقاتی پروگرام کی غیر موجودگی کی وجہ سے اُس کا قدم تجرباتی حدود سے آگے نہ نکل سکا۔ حال ہی میں اسے باقاعدہ سائنس کا درجہ دیا گیا اور "شمسی توانائی" ایک اہم ضرورتِ انسانی کی شکل میں نظر آنے لگی۔

"شمسی توانائی" زیادہ تر "گرمی" اور "روشنی" سے ترکیب پاتی ہے اور اسے "بلا واسطہ" اور "بالواسطہ" دونوں طریق سے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ 'بلا واسطہ' اسے گرمی کی شکل میں جمع کر کے اس سے کھانا پکانا، گھروں کو سردیوں اور گرمیوں میں علی الترتیب "گرم" اور "سرد" رکھنا، ایئر کنڈیشنگ اور ریفریجریشن کرنا وغیرہ جیسے کاموں میں بسہولت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بالواسطہ طور پر دھوپ کو بجلی میں تبدیل کر کے اس سے ہر وہ کام لیا جا سکتا ہے جو اس زمانہ میں بجلی کی بدولت انجام پا رہا ہے۔

جہاں تک دھوپ کو "حرارت" کی شکل میں جمع کرنے کا تعلق ہے یہ طریق بے حد آسان، کم خرچ اور مفید ہے اور اس سے

ایندھن کے تمام مسائل گھریلو اور ملکی سطح پر حل کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ طریق اپنی افادیت کے لحاظ سے محدود وسائل ہوا ہے۔ جس کی تفصیل کسی آئندہ اشاعت میں ہی پیش کی جا سکے گی۔

تاہم دھوپ کو بجلی میں تبدیل کر کے استعمال کرنے کا طریق گو مقابلتاً مشکل اور مہنگا ہے۔ لیکن اس کی افادیت ہر طور مسلّم ہے۔ چنانچہ اِس وقت مَیں اِسی طریق استعمال "شمسی توانائی" پر قدرے تفصیل سے بحث کروں گا۔

دھوپ کو بجلی میں تبدیل کرنے کے لئے بالعموم تین طریقے مستعمل ہیں:۔

پہلا طریقہ ۔ دو مختلف دھاتوں کو اگر اِس طرح جوڑ دیا جائے جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔

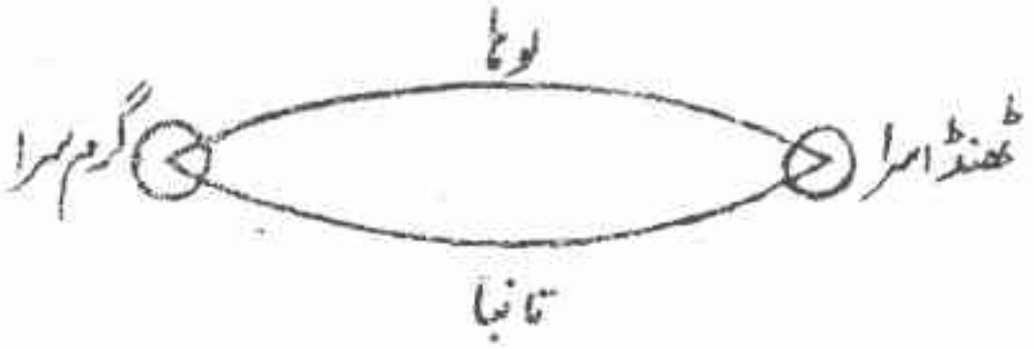

اور ان کے مشترک سروں کو مختلف درجہ حرارت پر رکھا جائے تو ان میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک سرے کو گرم کرنے کیلئے محدب عدسہ، شمسی عکاس وغیرہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ نیز زیادہ مقدار میں بجلی حاصل کرنے کے لئے بہت سے تار اسی ترتیب سے اکٹھے کر کے اور ان کے مشترک سروں کو مختلف درجہ حرارت پر رکھ کر گھر کے کاموں کے لئے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ پھر اس بجلی کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ ۔ شمسی توانائی کو بجلی میں تبدیل کرنے کا دوسرا طریقہ کیمیائی طریق کہلاتا ہے۔ دو مختلف دھاتوں کی سلاخوں کو ایک خاص کیمیائی محلول میں رکھ دیا جاتا ہے اور ان میں سے ایک سلاخ پر سورج کی روشنی ڈالی جاتی ہے جس سے بجلی کی رَو پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک سلاخ 'مثبت' اور دوسری 'منفی' بن جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اِس طریق سے حاصل شدہ بجلی مقدار میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بعض سائنسی تجربات کے علاوہ باقی کاموں میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا طریقہ ۔ دھوپ اور روشنی کو بجلی میں تبدیل کرنے کا نسبتاً مشکل اور مہنگا ہے لیکن افادیت کے لحاظ سے مندرجہ بالا طریقوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اسی لئے بڑی سرعت سے مقبول ہو رہا ہے۔ اِس طریق میں SILICON دھات کو خالص حالت میں حاصل کر کے اس میں ARSENIC یا GERMINIUM کی نہایت ہی قلیل مقدار شامل کر دی جاتی ہے جس سے اس میں یہ خوبی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ شمسی توانائی کو براہِ راست بجلی میں تبدیل کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایسے بہت سے CELL بنا کر انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ اسے شمسی بیٹری کہا جاتا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک مربع گز جگہ پر پڑنے والی شمسی توانائی اوسطاً ایک ہزار واٹ ہوتی ہے اور ایسی سائز کی شمسی بیٹری ۱۰۰ واٹ طاقت کی بجلی مہیا کر سکتی ہے۔ ایسی بیٹری کی فیصد افادیت گیارہ ہے جو بظاہر بہت زیادہ معلوم نہیں ہوتی لیکن مقابلتاً سب سے زیادہ ہے۔ گیارہ فیصد افادیت کا مطلب یہ ہے کہ بیٹری کی سطح پر پڑنے والی شمسی توانائی کا گیارہ فیصد حصہ

بجلی میں تبدیل ہوجاتا ہے باقی ۸۹ فیصد ضائع ہوجاتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ افادیت ۲۰٪ تک بڑی آسانی سے بڑھائی جاسکتی ہے۔

شمسی بیٹری کو استعمال کرنے کے کئی طریقے ہیں لیکن غالباً بہترین طریقہ عام سٹوریج بیٹری کو چارج کرنا ہے سٹوریج بیٹری کو ایک دفعہ چارج کرکے اسے متواتر کئی ماہ تک استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ بالعموم ۲۲ وولٹ نکل کیڈمیم (22-VOLT NICKLE - CADMIUM) بیٹری کو چارج کرنا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے اور مواصلات کی ضروریات کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ٹیلیفون، تار، ریڈیو وغیرہ۔

پاکستان جیسے ملک میں جہاں روایتی ایندھن از قسم لکڑی، کوئلہ، پٹرول، ڈیزل اور مٹی کا تیل وغیرہ بہت مہنگا ہے اور ملک میں اس کی قلت بھی شدت سے محسوس کی جارہی ہے شمسی توانائی نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوسکتی ہے۔ کروڑوں روپے جو ایندھن درآمد کرنے پر ہر سال خرچ کئے جاتے ہیں بچائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح اندرونِ ملک ایندھن کی کھپت کو اگر ختم نہیں تو بے حد کم ضرور کیا جاسکتا ہے۔

ہمارا ملک شمسی توانائی (دھوپ اور روشنی) کے لحاظ سے امیر ترین ملکوں میں سے ہے۔ گھروں اور فیکٹریوں میں شمسی توانائی کے استعمال سے ملک کا معیارِ زندگی بہت جلد بڑھایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں ایک سال میں ۳۰۰ سے زیادہ دن خوب دھوپ پڑتی ہے جس سے اگر کما حقہٗ فائدہ اٹھایا جائے تو پاکستان کے سبھی مسائل چند سالوں میں حل کئے جاسکتے ہیں۔

اس جگہ میں یہ عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ایٹمی توانائی پر جو خطیر رقم خرچ کی جارہی ہے اگر اس کا سوواں حصہ بھی شمسی توانائی پر خرچ کیا جائے تو کم از کم بیس گنا زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ذہنوں میں غلامی کچھ اس طریق سے رچ گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ سے آئی ہوئی ہر چیز متبرک سمجھی جاتی ہے خواہ وہ کتنی ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف ملکی دماغ اور وسائل کو ہمیشہ کمتر خیال کیا جاتا ہے ورنہ یہ مسائل جو پاکستان کو درپیش ہیں دراصل مسائل کہلانے کے بھی مستحق نہیں +

مظہر حسین
ایف ایس سی (سال اوّل)

راکٹ اور خلائی سفر

ابتدائے آفرینش سے انسان کی یہ آرزو رہی ہے کہ وہ زمین کی قیود سے آزاد ہو کر دوسرے سیاروں میں بھی پہنچے اور اُن کی سیر کرے یا کم از کم وہ اسے اچنبھا سا خیال کر کے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ ہیں کیا؟ چنانچہ انسان کی یہی خواہش دُوربین جیسی ایجاد کا موجب بنی۔ جب دُوربین ایجاد ہوئی تو انسان نے سیاروں اور چاند وغیرہ کا مشاہدہ کیا مگر یہ سب کچھ اُس کی پیاسی آنکھیں خود وہاں پہنچ کر دیکھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ اِسی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ڈاکٹر گاڈرڈ نے اپنی ساری زندگی اِسی کام میں صرف کی اور دنیا کی معلومات میں یہ کہتے ہوئے اضافہ کیا کہ وہ دن دُور نہیں جب انسان چاند پر سروے کرتا نظر آئے گا۔ اُس نے چاند تک پہنچنے کے لئے ایک آزمائشی راکٹ بنایا جو تقریباً ۵ افٹ تک گیا۔ اب تک تمام راکٹ ٹھوس ایندھن (Solid fuel) سے اُڑائے جاتے تھے مگر اِس میں نقص یہ تھا کہ آدمی زیادہ سے زیادہ اپنا راکٹ ہزار فٹ تک پھینک سکتا تھا۔ یہاں پر پھر خدا تعالیٰ کا دیا ہوا تحفہ عقل کام آیا اور روس کے ایک استاد نے جو راکٹ چلانے اور بنانے کا شوقین تھا یہ خیال ظاہر کیا کہ سیال ایندھن (liquid fuel) سے راکٹ کافی بلندی پر جا سکتے ہیں۔ چنانچہ تجربات کا سلسلہ پر شروع ہوا مگر اِسی اثناء میں جنگِ عظیم چھڑ گئی اور راکٹ بجائے چاند پر پہنچنے کے تخریبی مقاصد کے لئے بننے شروع ہو گئے۔ مثلاً جرمن نے بیشتر راکٹ لندن کو تباہ کرنے کے لئے چلائے۔ اگر لندن کے پاس رے ڈار جیسا آلہ نہ ہوتا تو شاید لندن کا نام ہی نہ باقی رہتا۔

آخر خدا خدا کر کے یہ جنگیں ختم ہوئیں اور دنیا کے اخبارات میں کچھ عرصہ بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ روس نے فضا میں ایک سیارہ چھوڑا ہے جس نے فضا میں گھومنا شروع کر دیا ہے۔ اِس سے جذبۂ تحقیق اوجِ ثریا پر پہنچا اور امریکہ نے بھی تجربات کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ عرصہ بعد ایک کُتیا خلاء میں پہنچ گئی اور اب انسان نے یہ کسر بھی پوری کر دی۔ کئی جانباز آدمیوں نے خلاء کی سیر کی یہ سب کچھ راکٹ کی بدولت ہوا اِس لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

راکٹ کی شہرت آجکل بہت زیادہ ہے مگر یہ زمانۂ جدید کی ایجاد نہیں بلکہ چینی لوگ آج سے ہزاروں سال پہلے اِس کا استعمال جانتے تھے۔ اِس بات کا مکمل تاریخی ثبوت موجود ہے کہ چین میں تیرھویں صدی عیسوی میں راکٹ بطور جنگی ہتھیار

استعمال کیا گیا اور برطانیہ نے اُنیسویں صدی کے اوائل میں کوپن ہیگن پر جو کہ ڈنمارک کا دارالخلافہ ہے راکٹوں کے ذریعہ حملے کئے مگر سب سے زیادہ تباہی جنگِ عظیم دوم میں جرمن کے ایجاد کردہ راکٹ وی ٹو نے مچائی جو دشمن کو تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تباہ کر دیتا تھا مگر جرمنی کی شکست پر تمام سائنس دان جو ان راکٹوں کے محرک تھے بٹ گئے اور اکثر روس چلے گئے جن سے روسی سائنسدانوں کو اپنی تحقیقات میں بڑی مدد ملی۔

راکٹ کی ساخت نیوٹن کے تیسرے قانونِ حرکت پر مبنی ہے یعنی اگر ایک سمت میں قوت کا اطلاق کیا جائے تو مخالف سمت میں بھی ضرور جھٹکا لگے گا۔ راکٹ کے عقبی حصے سے جتنے زور سے ہوا یا گیس خارج ہوگی وہ اتنی ہی قوت سے آگے چلے گا بشرطیکہ یہ قوت ہوا کی مزاحمت سے کم نہ ہو۔ خلا میں ہوا کی عدم موجودگی اور کششِ ثقل کی کمی کی وجہ سے راکٹ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلائی سفر راکٹ پر منحصر ہے۔ سائنس دانوں نے بالائی فضا کا جائزہ لینے کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ راکٹ کے اندر بندر، چوہے، حساس آلات اور ٹرانسمیٹر وغیرہ بند کر کے اُوپر بھیجے تا اُن کی واپسی پہ بالائی فضا کے حالات معلوم ہو سکیں۔ خودکار ٹرانسمیٹر راستے کے حالات نشر کرتے رہتے ہیں۔ جرمن وی ٹو اور امریکی ڈبلیو اے سی کارپورل راکٹوں کا ایک مجموعہ تقریباً ڈھائی سو میل کی بلندی پر پہنچا ہے۔ بندر اور چوہے زمین سے اسّی میل کی بلندی تک راکٹ کے ذریعے گئے ہیں۔ تقریباً اتنی بلندی پر خودکار کیمروں نے زمین کی جو فوٹو اُتاری ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ زمین گول ہے۔

نظامِ شمسی کا بھی زمین سے نزدیک ترین ستارہ چاند ہے۔ حساب دانوں کے اندازہ کے مطابق یہ فاصلہ بھی کم از کم ڈھائی لاکھ میل ہے۔ وہاں تک پہنچنے اور اُترنے کے لئے قوت اور ایندھن کی ایک بڑی مقدار ضروری ہے مگر روس نے اتنے سارے آدمیوں کو جو خلا میں پہنچایا اور واپس لایا ہے نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ دس سالوں میں ہم چاند پر پہنچ جائیں گے۔ راکٹ کی پرواز میں زمین کی کشش کو بڑا دخل ہے۔ جوں جوں ہم اُوپر جائیں یہ قوت کم ہوتی جاتی ہے اور تقریباً ۲۲۵۰ میل کی بلندی پر یہ قوت نصف رہ جاتی ہے۔ ۳۹۶۰ میل پر ایک چوتھائی اور اس سے دگنے فاصلے پر $\frac{1}{9}$ رہ جاتی ہے۔ یعنی زمین پر اگر کسی چیز کا وزن ۹ پونڈ ہو تو ۷۹۲۰ میل کی بلندی پر صرف ایک پونڈ رہ جائے گا۔ کشش کا یہ نظام صرف زمین پر ہی رائج نہیں بلکہ تمام کائنات میں جاری ہے۔ زمین کے علاوہ مزید آٹھ ستارے اسی کشش کے زیرِ اثر سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں پاتا جیسا کہ روسی تجربات نے ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر ہم اپنا راکٹ پانچ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چھوڑیں تو وہ زمین کی کشش سے آزاد ہو کر زمین کے گرد چکر لگانے شروع کر دے گا۔

اس کام کے لئے صرف ایک راکٹ ہی کافی نہیں سمجھا گیا کیونکہ زیادہ بلندی پر جانے کے لئے زیادہ ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے اس مشکل کو راکٹ کی کئی منزلوں سے دُور کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک لمبے چوڑے خول میں تین راکٹ محفوظ کر لئے گئے۔ پہلا راکٹ مشتعل کیا گیا اور وہ راکٹ کو کچھ بلندی پر لے گیا۔ جب اُس کا ایندھن ختم ہوا تو دوسرے نے اسی طرح کیا۔

اسی طرح باری باری تمام راکٹوں نے یہ عمل دہرایا اور راکٹ زمین کی کشش سے آزاد ہو گیا حتیٰ کہ اُس نے زمین کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔

۱۹۵۷ء میں انٹرنیشنل فزیکل ایئر کے سلسلے میں روس نے دو مصنوعی سیارے چھوڑے جن کو روسی زبان میں سپوتنک کہتے ہیں۔ پہلا سیارہ زمین سے ۵۶۰ میل کی بلندی پر چھوڑا گیا اُس کی رفتار ۵ میل فی سیکنڈ یعنی ۱۸۰۰۰ میل فی گھنٹہ تھی۔ دوسرا راکٹ ۹۳۰ میل کی بلندی پر اسی رفتار سے چھوڑا گیا۔ دوسرا سیارہ چھوڑنے کے کئی دن بعد تک اس کے سگنل تمام دنیا میں سُنے جاتے رہے۔ نیز ایئر کنڈیشنڈ کمرہ میں بیٹھے ہوئے کُتّے کے بھونکنے کی آواز آتی رہی اور تمام دنیا نے اسے بڑے غور اور دلچسپی سے سُنا۔ پھر کچھ عرصہ بعد انسان نے بھی خلائی سفر طے کیا۔ روس نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک ہی وقت میں دو مختلف راکٹوں میں ایک مرد اور عورت کو اُڑائے رکھا۔

اور وہ دن دُور نہیں جبکہ انسان چاند کی زمینوں پر قابض ہوگا +

"ایک مرتبہ ہمیر پور میں ایک مشاعرہ تھا۔ مَیں لکھنؤ سے چلا اور کانپور سے ایک صاحب ساتھ ہو لئے!

اجاڑ سی صورت عینک میں ایک طرف ایک دھجّی بندھی ہوئی۔ میلی سی ترکی ٹوپی۔ اُنگا کاسا چار خانے کا پاجامہ۔ ڈھیلی ڈھالی سی اچکن۔ ہیروں میں سِلا سا کرمچ کا جُوتا چیں چیں کرتی ہوئی آواز اور عجیب بھدّا سا نقشہ! ثاقب کانپوری نے تعارف کرایا کہ آپ مولیٰنا حسرت موہانی ہیں۔ مَیں تو سکتہ کے عالم میں رہ گیا ـــــ یا اللہ! ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی!!؟"

('حسرت موہانی کا خاکہ' ـــــ شوکت تھانوی)

"اہم تجویز یہ ہے کہ شاہکار افسانوں کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے انفرادی کوشش کی بجائے اجتماعی کوشش کی جائے۔ ان کا نظریہ ہے کہ اچھا آرٹ اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ تاج محل اور اجنتا کی تصاویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تاج محل تخلیق میں شاہجہان کے تخیل کے علاوہ ہزاروں انجینئروں اور معماروں کا ہاتھ ہے۔ اسی طرح اجنتا کی تصاویر صرف ایک آرٹسٹ کی جدّتِ طبع کی مرہونِ منّت نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اگر ہم انفرادی طور پر فرانسیسی یا روسی شاہکاروں کی گرد کو نہیں پہنچ سکے تو ہمیں اجتماعی طور پر ان کی ہمسری کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ششی موہن صاحب کی رائے میں ایک اچھا افسانہ ایک اچھی فلم کی طرح بہت سے آرٹسٹوں کے زورِ فکر کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ مثلاً ایک صاحب افسانے کا نام تجویز کریں دوسرے صاحب اس کا مرکزی خیال۔ افسانے کی زبان اگرامر کے تیسرے صاحب انچارج ہوں۔ تشبیہیں اور استعارے چوتھے آرٹسٹ کے ذمے لگائی جائیں۔ پانچواں ادیب روزمرّہ اور محاورہ وغیرہ کی صحت کا خیال رکھے۔ مطلب یہ کہ جہاں آجکل کئی افسانوں کا صرف ایک مصنّف ہوتا ہے وہاں ایک افسانے کے متعدد مصنفین ہوں اور افسانے کے شروع میں سب کا نام آئے۔
مثلاً:۔

نام	دیوندر ستیارتھی
مرکزی خیال	راجندر سنگھ بیدی
زبان اور گرامر	مولانا صلاح الدین احمد
تشبیہیں اور استعارے	کرشن چندر
روزمرہ اور محاورہ	چراغ حسن حسرت

اس طرح ایک ایسا افسانہ تیار کیا جائے جسے افسانوں کی دنیا میں تاج محل کا خطاب دیا جا سکے۔"

(شیشہ و تیشہ ـــــ کنہیا لال کپور)

بُوئے گُل، نالۂ دل.....

- شیر افضل جعفری
- مبارک احمد عابد
- محمد رفیع اختر
- عبدالحمید عابد
- نعیم قدسی
- کریم قمر
- محمد احمد
- بشارت جمیل

شبیر افضل جعفری

یہ انساں بھی جادُو کی پرکار رہے
کہ اس کے گھماؤ میں چودھار رہے

اگرچہ زمانہ دھوُاں دھار رہے
مگر اس میں زلفوں کا چمکار رہے

بشر موتیوں والی سرکار رہے
یہ جل اور تھل کا تُمن دار رہے

گلے میں اُترتا ہوُا تیر بھی
جری کے لئے دُودھ کی دھار رہے

اگر آگ سے کھیل جائے کوئی
تو پھر موت کشمیر کی نار رہے

شاعِر افضل جعفری

کوٹھے پہ بولے ہے کاگا   شاید ماہی آنے لاگا
چنا کی یونچپال دُلہن کا   گھونگھٹ بھی سونے پہ سُہاگا
ہر دے کی ڈھولک پہ گائیں   تھل کُرڑیاں سندھڑے میں آگا
اتنی چڑھی یاروں کی گُڈّی   ٹُوٹ گیا سنگت کا تاگا

آہوں کے بھونچال سے افضلؔ
بھگوان ڈونگھی نیند سے جاگا

رانا محمد رفیع اختر
بی-اے (سال دوم)

رندِ مشرب کا کچھ بھلا نہ ہوا
کعبہ جا کے بھی پارسا نہ ہوا

برقِ بے تاب ہی سلامت ہو
آشیاں کا ہے کیا! ہوا نہ ہوا

لوگ ملتے ہیں کتنی اُلفت سے
ہم پہ وہ مہرباں ذرا نہ ہوا

ہو گئے سب طبیب مجھ سے الگ
دردِ سینے سے جب جُدا نہ ہوا

عمر بھر وہ رہے خفا مجھ سے
عمر بھر جن سے میں خفا نہ ہوا

سوچتا ہوں کہ راہِ اُلفت میں
کیا ہوا ہم سے اور کیا نہ ہوا

مبارک احمد عابدؔ
ایف۔اے (سال دوم)

○

نجانے کیسی ہے اربابِ دل کی ساقی گری
"رہی چھلک کے بھی مینائے دل بھری کی بھری"

بہار آئی ہے اب دل کا حال کیا ہوگا !
کہ شاخِ زخمِ جگر ہوگئی ہے پھر سے ہری

مَیں عابدؔ اُن کی نظر سے شراب پیتا رہا
جو ساغروں میں پڑی تھی رہی دھری کی دھری

عبدالحمید عابدؔ
ایف۔اے (سال دوم)

○

وسعتیں کون و مکاں کی ساتھ لے آتے ہو تم
نبضِ عالم ڈوبنے لگتی ہے جب جاتے ہو تم

دھڑکنوں سے دل کی یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
قصّۂ غم شب کی تنہائی میں دُہراتے ہو تم

رقص کرتے ہیں ستارے جھومتی ہے کہکشاں
نظمِ عابدؔ شب کی تنہائی میں جب گاتے ہو تم

نعیم قدسی

اُلجھن

اِک طرف زہری نشیبوں کے انوکھے سلسلے!

اِک طرف اتنی بلندی ہے کہ تا اَوجِ فلک!

سنگِ لرزاں کی چٹانوں کے سوا کچھ بھی نہیں!

اِک طرف رس کی پھواروں کے انوکھے زمزمے!

اِک طرف اتنی خموشی ہے کہ مرگھٹ کا گماں!

اِک طرف سنگین پتھر اور بوجھل زلزلے!

اِک طرف میری تمناؤں کے شیشوں کا محل!

اِک طرف صندل کی خوشبوؤں سے مہکی وادیاں!

ایستادہ ہیں اندھیروں کی فصیلیں جن کے گرد!

اِک طرف کُہنہ روایات اور عقیدوں کا ہجوم!

اِک طرف میری نظر کی وسعتیں!

اجنبی دُکھ، بھاگتے سائے، اندھیرے راستے!

اتنے غم اور ایک میں!!!!؟

زندگی جیسے خلاؤں میں بھٹک کر رہ گئی۔

کریم قمر
بی۔اے (سال اوّل)

قندیلِ حق

چاند کی ایک معصوم ننھّی کرن
چڑھتے سورج کا بھی مُنہ چڑاتی رہی
وقت کا دیوتا سر جُھکاتا گیا
کہکشاں راستوں کو سجاتی رہی
آندھیوں کی اَمس جب بھی بڑھنے لگی
چاندنی اپنا دامن بچھاتی رہی
گرمیٔ خوں سے روشن یہ قندیلِ حق
عزم و ایماں کی شمعیں جلاتی رہی
کفر و باطل کا دامن سمٹتا رہا
زندگی کا حسیں رُخ نکھرتا رہا

مبارک احمد عابد

○

موسم ہے حسین، تنہائی ہے
ایسے میں تری یاد آئی ہے
یہ میرے غموں کا سایہ ہے
گھنگھور گھٹا جو چھائی ہے
مَیں شکوہ کروں تو کیسے کروں
شکوہ بھی تری رسوائی ہے
پتھر بھی جسے سُنکر روئیں
وہ تُو نے جفا دکھلائی ہے
جب مَیں نے تمہارا نام لیا
سب کہنے لگے سودائی ہے
دل روتا ہے تو رونے دے
کیوں آنکھ تری بھر آئی ہے

محمد احمد

"ٹیڈی ازم"

جو "ٹیڈی ازم" سی وباء ہو رہی ہے
شرافت جہاں سے ہَوا ہو رہی ہے
جدھر دیکھو عشقِ غلیظہ کے قصّے
یہ دنیا بڑی بے حیا ہو رہی ہے
نکالا ہے کیا پیرہن کا خلاصہ!!
ذلالت کی بھی انتہا ہو رہی ہے
نہ جنّت کی خواہش نہ دوزخ کی پرواہ
اِسی ڈھب سے دُنیا فنا ہو رہی ہے

بشارت جمیل
بی۔اے (سال اوّل)

"مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد"
ہے اب بھی مگر تیرے تبسّم کی ادا یاد

وہ سیلِ تمنّا ہے نہ وہ شورِ تلاطم
دل کو ہے مگر شورِ تلاطم کی صدا یاد

مجبورِ محبّت کو ہر اک راہ گزر سے
آتی ہے کسی عہدِ گزشتہ کی صدا! یاد

وہ واعظِ بے دین ہے یہ واعظِ دیندار
اُس کو ہے خدا یاد نہ اِس کو ہے خدا یاد

منزل بھی کٹھن راہ بھی دشوار تھی لیکن
صد شکر کہ مشکل میں بھی تو ہم کو رہا یاد

ہے طالعِ تقدیر ہی گردش میں جمیلؔ آج
ہے اپنی وفا یاد نہ ہے تیری جفا یاد

دامِ خیال

● مجیب اللہ خان

● سعید انجم

● انعام ہاشمی

مجیب اللہ خان
بی اے (سال اول)

آہ وہ دن.....!

چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ہم سب چاہتے تھے کہ دُور ـــــ بہت دُور ـــــ نیلی نیلی پہاڑیوں کے اُس پار ـــــ جھیل کے کنارے مچھلی کا شکار کھیلیں ـــــ

ایک دن صبح سویرے بادل کے وسیع و عریض ٹکڑے آسمان میں تیر رہے تھے ـــــ بارش نہ ہوئی ـــــ ہری ہری سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ اور ان پر لانبے لانبے درخت کچھ عجیب بہار پیدا کر رہے تھے ـــــ میں اپنی کھڑکی میں کھڑا قدرت کی ان بہار آفرینیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا ـــــ اور قدرت کی دل آویزیوں، نیرنگیوں اور رعنائیوں کے متعلق سوچ رہا تھا ـــــ کتنے لوگ ہیں جو مناظرِ قدرت کے متعلق سوچتے ہیں اور اُن پر نثار ہوئے جاتے ہیں ـــــ

سورج کی نور پاش کرنیں تیرتے ہوئے بادلوں کو چیرتی ہوئی پہاڑوں کے دامن میں جذب ہو رہی تھیں ـــــ ایسے میں گلہ بانوں کی بانسری کی خوش آیند آواز مست بنا رہی تھی ـــــ میں مطالعۂ قدرت میں ہمہ تن مشغول تھا ـــــ اور طرح طرح کے خیالات میں مستغرق کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا، اچانک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر ایسے سہانے موسم میں مچھلی کا شکار کھیلا جائے تو کتنا مزہ آئے ـــــ

اچانک جانی پہچانی آواز نے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا ـــــ "چلو جی فلسفی صاحب مچھلی کا شکار کھیلنے چلتے ہیں" ـــــ شاہین اور جمیل نے کہا ـــــ "جلدی بھی کرو، سُنا ہے جھیل میں بہت سی مچھلیاں ہیں ـــــ مناظرِ قدرت سے محظوظ ہونا ہو تو چلو جھیل کے شفاف پانی کو دیکھو ـــــ مرغابیوں کے غول کا مشاہدہ کرو ـــــ درختوں کی ہریالی پر نگاہ ڈالو ـــــ اور اس کے گرد و نواح کی زمین تو واقعی ہری وردی پہنے دکھائی دیتی ہے ـــــ" "ہم نے کیمرہ بھی لے لیا ہے" دونوں نے کہا ـــــ "ذرا ٹھہرو! امّی سے اجازت لے لوں" میں نے کہا ـــــ "کیوں! وہاں بغیر اجازت جاتے ہوئے تمہیں ڈر لگتا ہے کیا؟" ـــــ "پھر تو تم بہت ہی ڈرپوک ہو" ـــــ دونوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ـــــ "دیکھو ہم جیبوں میں پراٹھے بھی بھر لائے ہیں اور دوسری ضروری اشیاء بھی چھپا کر لے آئے ہیں، اس لئے کچھ ساتھ لینے کی ضرورت نہیں" ـــــ

مجھے یہ دونوں دوست بہت ہی عزیز تھے، اکھٹی کھیلی کھڑی ہونے کے باعث مجھے ان کی دل شکنی منظور نہ تھی لہٰذا ساتھ ہو لیا ـــــ ہم تینوں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر گامزن ہوئے ـــــ

ایک طرف اُونچے اونچے پہاڑ جن کی چوٹیاں آسمان کی نیلگوں فضا میں گُم ہو کر رہ جاتیں ـــــ دوسری طرف وادیوں کی عمیق گہرائیوں میں نظر ڈال کر دل کانپ اُٹھتا اور جان خشک ہوتی ـــــ ہم اِن دلفریب مناظر میں کھو جاتے، قدرت کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرتے ـــــ باتوں کا جھاڑ باندھتے، پگڈنڈی پر رواں دواں بڑھتے رہے اور ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد اِس ڈھلوان پر پہنچے جہاں سے جھیل کا پانی چادرِ سیماب دکھائی دے رہا تھا ـــــ جلد جلد جھیل کے کنارے پہنچ گئے ـــــ منظر واقعی دلکش اور جاذبِ نظر تھا ـــــ

گلابی جاڑا! جھیل کے کنارے خودرَو پھولوں کے ننھے مُنّے پودے ـــــ کئی قسم کے پھول ـــــ سُرخ، سفید، زرد، نیلے ـــــ جیسے کوئی گلدستہ ـــــ درختوں کی لانبی، بے جان اور جُھکی ڈالیوں سے اوس کے ننھے ننھے قطرے پہلو کے پانی میں گر کر ذرا سی دیر کے لئے ہلچل مچا دیتے جیسے خاموش دریا کے سینے میں طوفان اُٹھا ہو ـــــ اور پھر وہی خاموشی چھا جاتی ـــــ پھر وہی سکوت مسلط ہو جاتا جو قطرے گرنے سے پیشتر فضا پہ مسلط تھا ـــــ اور خاموش پانی میں برگد کے پھل گر گر کر فضا میں ایک موسیقی پیدا کر رہے تھے ـــــ

ہم لوگ پانی میں کُنڈیاں ڈال کر بیٹھ گئے ـــــ مچھلی کا شکار واقعی بہت صبر آزما ہوتا ہے ـــــ سانس روک کر گھنٹوں صمٌ بکمٌ بیٹھے رہنا آسان کام نہیں ـــــ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ ہم نے تھوڑی سی دیر میں بہت سی مچھلیاں پکڑ لیں ـــــ پراٹھوں سے بھوک مٹائی ـــــ دو بجے کے قریب مَیں نے واپس چلنے کی تجویز پیش کی ـــــ مگر میری بات کاٹتے ہوئے دونوں نے کہا "اتنی بھی کیا جلدی ہے، چار بجے چلیں گے اور پانچ چھ بجے تک پہنچ ہی جائیں گے ـــــ چنانچہ ہم نے مچھلیوں کو ایک محفوظ مقام پر رکھ کر اِرد گرد کے خوبصورت مناظر کو دیکھنا شروع کیا ـــــ

کبھی پانی میں پاؤں لٹکاتے ـــــ کبھی پہاڑی کے دامن میں چھوٹی چھوٹی آبشاروں کا مشاہدہ کرتے ـــــ اور کبھی مرغابیوں کے گروہوں پر نگاہ دوڑاتے ـــــ جھیل کے چاروں طرف ـــــ دُور پہاڑوں پر چڑھ کے درختوں کے لامتناہی سلسلے دلفریب مناظر پیش کر رہے تھے ـــــ میری نگاہیں خاموش پانی کی ننھی لہروں میں کسی چیز کو گھور رہی تھیں ـــــ زرد پتے پانی میں بہہ رہے تھے ـــــ گاہے گاہے کسی ریتیلے اُبھار یا پانی میں اٹکی ہوئی جھاڑیوں سے ٹکرا کر رُک جاتے ـــــ آہستہ آہستہ تہوں کا ڈھیر لگ جاتا ـــــ جب ہوا کا جھونکا آتا تو یہ ڈھیر ہولے ہولے پھر بہنے لگتا ـــــ سورج کی روپہلی کرنوں میں یہ زرد پتے سونے کی طرح چمکتے ـــــ مگر سائے میں پہنچ کر اُن پر پہلی سی مُردنی چھا جاتی ـــــ

ہم سمجھتے تھے کہ جگہ دُور ہونے کی وجہ سے فرشتہ بھی دم نہ مارتا ہوگا ـــــ مگر دُور پہاڑوں میں سے کہیں گڈریے کی بانسری کی دلفریب اور خوش کُن تانیں مسحور کُن ماحول پیدا کر دیتیں ـــــ ہمارے قلک شگاف قہقہے اِس مکمل سکوت میں ـــــ معصوم نکھری نکھری، ٹھنڈی ٹھنڈی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ـــــ

بڑی دیر تک ہم یونہی پھرتے رہے۔ شاہین کا کیمرہ اِن کی نقاشی کرتا رہا ـــــ ہم ابھی مصروفِ گلگشت ہی تھے کہ

آسمان پر کالی کالی بدلیاں چھانے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پُرسکون ماحول میں ایک ہیجان برپا ہوگیا ـــــ ہوا اور گھٹا ٹوپ اندھیرا کسی آنے والے طوفان پر دلالت کرتا تھا ـــــ ہم دن بھر کی محنت ساتھ لے کر چل پڑے۔ ابھی ہم ڈھلوان ہی تک پہنچے تھے کہ طوفانی بارش ہونے لگی ـــــ قدم ڈگمگانے لگے ـــــ کتنا خوفناک تھا وہ منظر ـــــ کتنا ہولناک تھا وہ سفر ـــــ کتنا وحشتناک تھا وہ رستہ ـــــ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے پانی دھائیں دھائیں کرتا، آبشاروں کی طرح گرتا اور پھر ـــــ وادیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں گم ہوجاتا ـــــ

زہریلے ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا رستہ ـــــ وہ بھی متعدد جگہوں سے ٹوٹا ہوا ـــــ ہم گاہے گاہے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے تسلیاں دیتے چلے جارہے تھے ـــــ

اچانک طوفان کا ایک ایسا ریلہ آیا کہ میرے دونوں ساتھی میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ـــــ میں چیخا۔ چلایا ـــــ مگر میری آواز بادل کی کڑک، بجلی کی چمک، چیڑھ کے سر بفلک درختوں کی تڑاق پڑاق ـــــ ہوا کی سائیں سائیں، آبشاروں کی دھائیں دھائیں میں ہی کہیں گم ہوکر رہ گئی ـــــ میں دل کڑا کرکے بڑھتا رہا ـــــ دامن پتھر تلے دیدیا ـــــ اِدھر دیکھا کنواں ـــــ اُدھر دیکھا کھائی ـــــ آگے بڑھنا سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ـــــ اور دائیں طرف قدم رکھنا گویا موت کو دعوت دینا تھا ـــــ اور بائیں بڑھنا ـــــ اُف موت! موت کے بھیانک سائے ناچ رہے تھے ـــــ

دل ڈوبا جارہا تھا۔ پھیپھوڑے جل رہے تھے ـــــ اجل سر پر منڈلا رہی تھی ـــــ میں پتھروں کا سہارا لیکر دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ جہاں طوفانی زور بڑھ جاتا وہیں تھم جاتا ـــــ میں اپنی بدنصیبی کا دل ہی دل میں ماتم کررہا تھا کہ اچانک میرا ہاتھ کسی ہاتھ سے ٹکرایا ـــــ یہ جمیل تھا ـــــ اب ہمارے جگر میں کانٹا اٹکا کہ ہائے! شاہین کدھر چلا گیا؟ کلیجہ دھک سے رہ گیا ـــــ اُس کی تلاش میں ہم نے کنویں میں بانس ڈالے ـــــ مگر اُس کا کہیں بھی پتہ نہ لگا ـــــ خوب پاؤں پیٹے ـــــ ناچار پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ـــــ ہم نے شاہین کی تلاش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ـــــ آوازیں دیں ـــــ لیکن پہاڑوں میں گونجتی ہوئی ہمیں صرف اپنی آواز ہی سنائی دیتی تھی ـــــ

یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ ـــــ آسمان کیوں پھٹ پڑا ـــــ؟ میں چیخ کر بولا ـــــ ہم آب ہوئے ـــــ آٹا اور گیلا ہوا ـــــ آگے کے قدم پیچھے پڑنے لگے ـــــ

..... میرا اضطراب بڑھتا گیا ـــــ میں وقفے وقفے کے بعد اُس کو پکارتا ـــــ میرے اس اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے جمیل نے کہا ـــــ "شاید وہ آگے نکل گیا ہو" ـــــ "خدا کرے ایسا ہی ہو" ـــــ میں نے جواب دیا ـــــ

اب ہم دونوں اُس چھوٹے سے گاؤں کی طرف چل پڑے جو اُس پہاڑ کے دامن میں تھا ـــــ

سورج اپنی مختلف الالوان کرنیں سمیٹ کر ایوانِ مغرب میں روپوش ہوچکا تھا اور تاریکی کی ڈراونی سیاہ زلفوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ـــــ ہم نے رات اُس گاؤں میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی اور صبح سویرے

ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئے ——

سورج نے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکنا شروع کیا اور اس کی پیلی پیلی کرنیں چیڑھ کے درختوں سے چھن کر دھندلکے کو چیرتے ہوئے، شبنمی قطروں سے منعکس ہوتے ہوئے ہم تک پہنچ رہی تھی —— ہم دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے جا رہے تھے —— رہ رہ کے دل میں خیال آتا تھا —— "خدا کرے شاہین گھر خیریت سے پہنچ گیا ہو" ——

ابھی ہم گاؤں سے زیادہ دُور نہ گئے تھے کہ ہمیں چند آدمی کسی کو چارپائی پر لٹائے ہمارے گاؤں کی طرف جاتے دکھائی دیئے —— چارپائی دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا —— میں نے جمیل کی طرف غور سے دیکھا، مگر زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکا —— جمیل کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ بھی غم و الم کی غمّازی کر رہا تھا ——

وہ لوگ سستانے کے لئے ایک درخت کے نیچے رُکے —— ہم اُن کے قریب پہنچ گئے —— اُن میں سے ایک شخص نے مجھے اشارہ سے بُلایا اور کہا —— "یہ ایک بچے کی لاش ہے جو ہمیں اِس ڈھلوان کے سرے پر سے ملی —— ہم اِس کو بڑے گاؤں لے جا رہے ہیں تاکہ شناخت ہو سکے —— "بیٹا! کیا تم اِسے جانتے ہو" —— اُن میں سے ایک نے لاش کے مُنہ سے کپڑا ہٹاتے ہوئے پوچھا —— میں لاش کو دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گیا —— "میرے شاہین! —— تم نے اچھا مچھلی کا شکار کھیلا! تم تو خود شکار ہو گئے ——

شاہین حیات! تم تو بڑے بہادر تھے —— تم نے حیات ہوتے ہوئے موت کا مقابلہ کیوں نہ کیا —؟ بولو! میں تمہارے ابا سے کیا کہوں —— تمہارے امّی کو کیا جواب دوں گا" —— میرا غم گسار دوست —— میرا ہمیشہ ساتھ رہنے والا ساتھی آج مجھ کو اکیلا غمگین چھوڑ کر جا چکا تھا —— دُور —— بہت دُور —— اتنی دُور جہاں غم اور تفکرات کے سائے بھی نہیں پہنچ سکتے ——

ماں باپ کا اکلوتا بیٹا —— شاہین —— عصائے پیری بننے کے بجائے انہیں داغِ مفارقت دے گیا —— عین عنفوانِ شباب میں اُس نے زندگی کا سفر ختم کر دیا ——!

میں جب کبھی اُوپر والے کمرے میں بیٹھ کر دریچے سے نیلی نیلی سبز سبز پہاڑیوں پر کالے کالے بادل منڈلاتے دیکھتا ہوں تو وہ دن، وہ وقت، اور وہ سماں میری آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور میرے ذہن میں شاہین کا نقش اُبھر آتا ہے —— اور میں بے قرار ہو کر آنسوؤں سے دامن تر کر لیتا ہوں اور مُنہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے ——

حیات اِک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

سعید انجم
بی۔اے (سال اوّل)

ساکن ہاتھ

"جوگندر، جوگندر" ساندھرو نے آواز دی۔

"کیا ہے؟" چھپّر کے نیچے بچھی ہوئی چارپائی پر ایک میلی سی دھوتی باندھے ہوئے بیٹھے لڑکے نے جواب دیا۔

"شہر سے کچھ بابو لوگ آئے ہیں" ساندھرو نے بتایا۔

"تو مَیں کیا کروں؟"

"اُن کے پاس کچھ عجیب سی چیزیں ہیں۔ بہت سے لڑکے دیکھ رہے ہیں آؤ ہم بھی دیکھیں۔"

"مجھے نہیں دیکھنی تم جاؤ دیکھو۔"

"پتہ ہے اُن کے پاس ایک کالی سی چیز ہے جس کو آنکھوں سے لگا لینے سے دُور کی چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ پھر ایک چھوٹی سی لکڑی بھی ہے اگر اُس کو مُنہ سے لگائیں تو وہ بجتی ہے۔ مَیں تو دیکھ آیا ہوں۔ آؤ دیکھتے ہیں۔"

"کہہ جو دیا ہے مجھے نہیں دیکھنی یہ سب چیزیں۔ تم جاؤ۔"

ساندھرو بے چارہ چپکے سے مُنہ نیچے ڈال کر چلا گیا۔ وہ جوگندر کا دوست تھا اور ہر بات میں اُس کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ اُس نے سوچا چلو یہ عجیب چیزیں جوگندر کو بھی دکھا دے لیکن وہ مانا ہی نہیں۔

جوگندر نے جب سے نمبردار کے پاس آنے والے افسر کی کار دیکھی تھی اُس دن سے اُس کو کسی اَور چیز سے کوئی کشش ہی نہ رہ گئی تھی۔ بس وہ ہر وقت کار ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور انتظار میں رہتا تھا کہ پھر دوبارہ کار آئے لیکن اُس کی مراد ابھی تک پوری نہیں ہوئی تھی۔

اُس روز وہ لسّی پی رہا تھا کہ باہر سے "پُوں" کی آواز گونجی۔ اُسے یہ آواز بھلی لگی باہر بھاگ کر گیا تو نمبردار کے گھر کے سامنے ایک بہت پیاری سُرخ اور سفید رنگ کی پہیوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ اُس کے چاچا نے بتایا تھا کہ اُسے کار کہتے ہیں۔ چند لمحوں میں وہاں بچّوں کی بھیڑ لگ گئی۔ خاکی کپڑے پہنے ہوئے ایک آدمی بچّوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا اور بچّے اصرار کر رہے تھے کہ پھر "پُوں" کرو۔ آخر بچّوں کے اصرار کرنے پر وہ پھر اندر بیٹھ گیا اور "پُوں" کرنے لگا۔ اور اُتنی دیر میں جوگندر

نے جلدی سے کار پر ہاتھ پھیر لیا تھا۔ کار بہت ملائم تھی۔ کار کو ہاتھ لگانے سے پہلے اُس کا خیال تھا کہ سب سے ملائم نمبردار کا وہ کمرہ ہے جہاں کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جب افسر لوگ آتے ہیں اُس وقت اُن کے لئے کھولا جاتا ہے۔ جہاں کچھ کرسیاں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ جوگندر صرف ایک دفعہ وہاں گیا تھا' وہ بھی نمبردار کے دوستوں کے ہاتھ دُھلانے' اور اُسے اپنے پاؤں پھسلتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ پھر جب ہاتھ دُھلا چکا تو گندے پانی والی بالٹی اُٹھانے کے لئے اُس نے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے جلدی سے نیچے جُھک کر فرش پر بھی ہاتھ پھیر لیا تھا۔ وہ اُسے بہت ملائم لگا تھا۔ لیکن اِس روز کار کو ہاتھ لگانے سے اُسے کمرے کی ملائمت بھُول گئی اور کار اُس سے کہیں زیادہ ملائم لگی۔ جب وہ خاکی پتلون قمیص والا آدمی کار سے "پُوں" کر کے باہر نکلا تو جوگندر نے بڑی معصوم سی صورت بناتے ہوئے کہا تھا "بابو جی ایک دفعہ اَور" تو اُس نے ایک دفعہ پھر "پوں" کر دیا' اور اتنی دیر میں جوگندر نے دوسری طرف سے کار پر ہاتھ پھیر لیا۔ اور پھر وہ کتنی دیر تک ہی اپنے اُس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر پھیرتا رہا۔ گویا کار کی ملائمت کا اثر اُس کے ہاتھ پر بھی ہو گیا تھا۔

اب جوگندر سوچتا تھا کہ اگر پھر وہی کار آئے تو وہ اُس خاکی کپڑوں والے سے کہے گا کہ وہ اُسے کار میں بٹھا لے' اور اُسے اُمید تھی کہ وہ اس کی بات مان لے گا' آخر پہلی دفعہ بھی تو اُس نے اُس کی بات مان ہی لی تھی۔ لیکن اُس کا انتظار لمبا ہوتا گیا' اور وہ کار والا نہ آیا۔ وہ اکثر اپنے چاچا سے کار کے بارہ میں پوچھتا رہتا جو قریبی شہر میں کسی کے گھر نوکر تھا۔ ہر صبح سویرے چلا جاتا اور پھر رات گئے واپس آتا۔ لیکن وہ شہر کا جاننے والا چاچا بھی اُس کو کچھ نہ بتا سکا۔

اُس کا چاچا بھی بہت عجیب چیز تھی ——— رات کو جب بوڑھے بڑ کے درخت کے پاس سب لوگ آگ کے الاؤ جلا کر بیٹھے باتیں کیا کرتے یا کبھی کبھار بوڑھے بیراگی سے کہانی سُن رہے ہوتے تو اُس وقت اُس کا چاچا شہر سے واپس آیا کرتا تھا وہ انہیں شہر کے متعلق بہت سی باتیں سُناتا۔ جوگندر پوچھتا کیوں چاچا وہاں کوئی کار بھی ہے شہر میں؟

وہ ہنس کر کہتا کوئی ایک۔ وہاں تو کئی کاریں شوں فوں کرتی ہر وقت گزرتی رہتی ہیں۔ اِس طرح جوگندر کو پھر پتہ لگ گیا کہ کار شوں فوں کر کے گزرتی ہے۔ اور پھر وہ اکثر تیزی سے بھاگتا اور اپنے ساتھیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے شوں فوں کرتا اور کہتا کہ دیکھا نا میں کار کی طرح شوں فوں کرتا ہُوا بھاگتا ہوں لیکن اُس سے وہ تیز رفتاری کبھی پیدا نہ ہوئی جس تیز رفتاری سے اُس روز نمبردار کے افسروں کی کار شہر کی طرف واپس گئی تھی۔ وہ تو آنکھ جھپکتے ہی پکی سڑک پر مُڑ گئی تھی اور جوگندر پوری طاقت سے بھی بھاگتا تو بھی اُسے اُس موڑ تک پہنچتے پہنچتے دس پندرہ منٹ لگ جاتے۔ لیکن یہ بات اُس کے ساتھیوں میں سے کبھی کسی نے نہ کہی۔ وہ سب جانتے تھے کہ واقعی جوگندر کار کی طرح شوں فوں کر کے بھاگتا ہے۔ آخر وہ اُن سب سے زیادہ تیز دوڑتا تھا۔

ہوتے ہوتے دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ جوگندر کے گاؤں والوں نے دو فصلیں کاٹ لیں لیکن پھر دوبارہ کوئی کار نہ آئی۔ اب جوگندر کا شوق اور تیز ہوتا جا رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ شہر میں جا کر کار دیکھ آئے لیکن اُس کا باپ اُسے جانے ہی کب دیتا تھا۔ اُس نے کئی بار اپنے چاچا کو بھی کہا کہ وہ اُسے شہر لے چلے لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے مالکوں کے سامنے ایک

عطیہ جناب

گندی سی میلی دھوتی پہنے ہوئے لڑکے کو لے جائے۔

جوگندر کے باپ نے سوچا اب جوگندر کو کام پر لگایا جائے ہل وغیرہ ہی چلانے لگا۔ چنانچہ جوگندر اپنے باپ کے ساتھ کھیت پر جانے لگا۔ ہل میں جُتے ہوئے بیل جب سانس لیتے اور شُوں شُوں کی آواز پیدا ہوتی تو اُس کا دل تڑپ اُٹھتا۔ ایک دن اُسے خیال آیا کہ یہ بیل کار کی طرح شُوں شُوں تو کرتے ہیں لیکن اُتنے تیز کیوں نہیں ہوتے۔ وہ اپنے باپ کو کہتا کہ انہیں تیز چلائے لیکن اُس کا باپ صرف مسکرا دیتا۔

ایک روز دیر ہوگئی اُن کی روٹی نہ آئی تو جوگندر نے خود ہی کہا لاؤ بابا میں اکیلا ہی ہل چلاتا ہوں تم جاکر روٹی لے آؤ۔ اُس کا باپ بیل اُس کے حوالے کر کے چلا گیا۔ بیلوں نے چلتے ہوئے شُوں شُوں کیا اور اُسے کار یاد آگئی۔ اُس نے بیلوں کو تیزی سے چلانا شروع کر دیا لیکن وہ زیادہ تیز نہ ہوئے۔ وہ چاہتا تھا کہ پل جھپکتے میں جس طرح کار وہ پکی سڑک والا موڑ مڑ گئی تھی اسی طرح پل جھپکتے ہی یہ بیل کھیت کا چکر پورا کرلیں لیکن بیل نہ مانے۔ اُس نے چھڑی برسانی شروع کر دی۔ پہلے تو بیل کچھ تیز ہوئے لیکن جوگندر تو اور تیزی چاہتا تھا اُس نے اُنہیں بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ آخر بیل کب تک مار کھاتے۔ وہ سرکش ہوکر بھاگے۔ کھیت کی منڈیر کو توڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ جوگندر سے سنبھالا نہ گیا۔ وہ خود بھی گر گیا۔ اُسے خوب چوٹیں آئیں اور ہل وغیرہ بھی ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس کا باپ آیا تو وہ یہ حالت دیکھ کر سخت ناراض ہوا۔ جب ٹوٹا ہوا ہل اور ایک بیل کا خون نکلتے ہوئے دیکھا تو آپے سے باہر ہوگیا۔ اُس نے گھونسوں اور لاتوں سے جوگندر کی خوب خبر لی۔ اور پھر اُسی شام جوگندر کے چاچا نے بتایا کہ اُس کے مالک کو گھر کے چھوٹے موٹے کام کے لئے ایک لڑکے کی ضرورت ہے۔ اور یہ سُن کر جوگندر کے باپ نے جوگندر کا نام پیش کر دیا۔ اُسی رات اُس کے لئے ایک پاجامہ بنایا گیا اور صبح جوگندر کو صاف ستھرے کپڑے پہنا کر چاچا اپنے ساتھ لے گیا۔ راستے میں اُس کا چاچا اُسے بہت نصیحتیں کرتا رہا کہ اِس طرح سلام کرنا، اِس طرح باتیں کرنا۔ یہ باتیں سمجھ کر جوگندر اپنے چاچا کے ساتھ اپنے نئے مالک کے سامنے جا حاضر ہوا اور جوگندر نوکر رکھ لیا گیا۔

جوگندر شہر میں نوکری کرنے پر بہت خوش تھا۔ اب وہ ہر روز بہت سی کاریں دیکھتا اور اُس نے ایک ہفتہ میں تقریباً چودہ مرتبہ کار پر ہاتھ بھی پھیر لیا تھا۔ دراصل اُس کے مالک کے سامنے والے گھر میں کوئی بڑا سوداگر رہتا تھا جس کی اپنی بھی کار تھی اور اُس کو ملنے والے بھی اکثر کاروں ہی میں آتے تھے۔ اِس طرح جوگندر کسی بہانے سے باہر آ کر کار پر ہاتھ پھیر لیا کرتا تھا۔ اِس سے اُسے بہت سکون ملتا۔ اب اس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ کار میں سوار بھی ہو لیکن اُس کی یہ مراد بر آتی ہوئی دکھائی نہ دیتی تھی۔

ایک روز اُس نے دیکھا کہ سامنے والے سیٹھ کا نوکر جو اُس جتنا ہی لڑکا تھا اپنی مالکہ کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا ہے اور سیٹھ نے اُسے کچھ بھی نہ کہا اور کار چل دی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ زور سے چیخ کر سیٹھ کو آگاہ کر دے کہ اُس کا نوکر بھی کار میں بیٹھ گیا ہے لیکن اُس کے حلق نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور کوشش کے باوجود بھی اُس کی آواز نہ نکل سکی۔ اُس نے سوچا کہ کاش! وہ سیٹھ

کے ہاں نوکر ہوتا، روزانہ کار کو صاف کیا کرتا اور صاف کرنے کے بہانے سے کبھی کبھار اُس میں بیٹھ کر بھی دیکھ لیتا۔ اور پھر جس طرح یہ دوسرا نوکر مالکہ کے ساتھ بیٹھ کر کہیں گیا تھا وہ بھی کار میں بیٹھ کر جا سکتا لیکن وہ اپنے آپ کو اس قسم کی باتیں سوچ کر بہت لاچار پاتا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

اگلے روز اُس نے دیکھا کہ پھر سیٹھ کا نوکر دوبارہ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کہیں جا رہا تھا۔ اُس روز اُسے اپنی بے بسی پر بہت رونا آیا اور آخر اُس نے سوچا کہ اُسے اپنے چاچا سے یہ بات کہہ دینی چاہیئے۔ شاید وہ اُسے سیٹھ کے ہاں نوکر کروا سکے۔ بالآخر اُس نے اپنے چاچا کو کہہ ہی دیا۔

"چاچا!"

"کیا بات ہے؟"

"ایک بات کہوں"

"ہاں کہو" چاچا نے جواب دیا۔

"بُرا تو نہ مانو گے"

"اگر بُرا ماننے کی نہ ہوئی تو نہیں مانوں گا۔"

"مجھے سامنے والے سیٹھ کے گھر نوکر کروا دو۔"

"کیوں؟" حیرانی سے اُس نے پوچھا۔

"وہ دیکھو نا چاچا.... چاچا اُن کا نوکر کار میں بھی بیٹھتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا"

"تو..... تو پھر میں بھی بیٹھوں گا۔"

چاچا ہولے سے مسکرا دیا۔

"اچھا تو تم کار میں بیٹھنے کے لئے سیٹھ کی نوکری کرنا چاہتے ہو"

"ہاں"

چاچا زور سے ہنس دیا۔

"کیوں بھئی کس بات پر اتنی زور سے ہنسا جا رہا ہے؟" ایک دم جوگندر کے مالک نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہمارا جوگندر سیٹھ کے ہاں نوکری کرنا چاہتا ہے۔"

جوگندر کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"کیوں؟" ماتھے پر بل ڈال کر اُس نے پوچھا۔

"جی یہ کہتا ہے کہ سیٹھ کا نوکر کار میں بیٹھتا ہے اور جب میں سیٹھ کا نوکر ہوں گا تو کار میں بیٹھوں گا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"کیوں بھئی جوگندر تمہیں بہت شوق ہے کار میں بیٹھنے کا۔"

جوگندر سے بولا نہ گیا۔

"ارے بتاؤ"

"جی۔" بڑی مشکل سے اُس کے مُنہ سے نکلا۔

"ارے ہم تم کو کار کی سیر کروا دیں گے۔"

جوگندر اپنے آپ کو ہوا میں اُڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

"دیکھا نا بابو جی کار میں بیٹھنے کا سُن کر کتنا خوش ہو گیا ہے" اُس کے چاچا نے کہا۔

جوگندر کا جی چاہا کہ وہ اپنے مالک کے پاؤں پڑ جائے اور اپنے چاچا کے گلے لگ جائے لیکن کچھ نہ کر سکا۔

وہ ایک دم اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی سمجھنے لگا کہ اب وہ بھی کار میں بیٹھے گا۔ اس کے ذہن میں کار کی ملائمت دوڑ گئی۔ وہ اپنے کار پہ پھرے ہوئے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر پھیرنے لگا۔ خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مالو چلا گیا۔

جوگندر ویسے ہی کھڑا تھا۔ اُس نے تھوڑی دیر کے بعد نظریں اٹھا کر دیکھا کہ اُس کا چاچا اکیلا ہی کھڑا تھا۔

"چاچا"

اور ایک دم سے اُچھل کر اُس کے گلے لگ گیا۔ اُسے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ وہ اپنے چاچا کے جسم میں مدغم ہو جانا چاہتا تھا۔

"چلیا" اُس نے پھر کہا اور چُومنے لگا "تم بہت اچھے ہو چاچا، تم بہت اچھے ہو۔"

وہ پاگلوں کی طرح اپنے چاچا کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔

"ارے چھوڑو بھی، پاگل ہو گئے ہو کیا" اور آخر بڑی دقت سے جوگندر کو چاچا نے علیحدہ کیا۔

اُس روز جوگندر نے اپنا پیلا میلا پاجامہ خوب اچھی طرح دھویا۔ آخر اُس نے کار میں بیٹھنا تھا۔ وہ اپنے چاچا کے ساتھ گاؤں چلا جایا کرتا تھا لیکن اُس رات وہ وہیں رہنے کی ضد کرنے لگا۔

"ارے پاگل ہو تم بے وقوف لڑکے، بابو بھلا تمہیں کس جگہ سلائیں گے۔" اور اِس طرح بڑی مشکل سے اُس کا چاچا اُسے گاؤں لے گیا۔

بوڑھے بڑ کے درخت کے نیچے چاچا شہر کی باتیں سُنانے لگا اور جوگندر اپنے ساتھیوں کو لے کر ذرا پرے ہو کر بیٹھ گیا اور بڑے فخر سے کہنے لگا میں کار میں بیٹھوں گا۔ بعض لڑکے اُس کی قسمت پر رشک کرنے لگے اور کچھ نے اسے ایک گپ ہی سمجھا۔

ساری رات جوگندر کو خوشی کی وجہ سے نیند نہ آسکی۔ وہ صبح بہت جلدی اُٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ اُس کا چاچا بھی اُٹھ جائے لیکن وہ نہ اُٹھا تو تنگ آکر جوگندر نے خود ہی اُسے جگا دیا۔ پھر روٹی اور لسی کھا کر دونوں شہر روانہ ہوئے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں بچے تو سکول چلے گئے اور مالک اپنا بیٹ لیکر دفتر کو سدھارا۔ جوگندر بیچارہ دیکھتا ہی رہ گیا، اُس سے کچھ بھی نہ بولا گیا۔ اُس نے سوچا کہ دفتر سے واپسی پر مالک اُسے سیر کرنے لے جائیگا اسلئے چُپ ہو رہا۔ اُس روز وہ تیزی اور پھرتی سے بھاگ بھاگ کر کام کرتا رہا۔ دوپہر کو مالک گھر آیا۔ جوگندر نے کہا کہ لاؤ بابو جی پاؤں دبا دوں تو اُس کا مالک ہنس پڑا۔

"کیوں جوگندر کیا بات ہے آج؟"

"کچھ نہیں حضور"

"تو آج اتنی جلدی اور اتنے اچھے کام کر رہے ہو۔"

جوگندر صرف ہنس دیا۔ وہ دوبارہ کار پر سوار ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر ایک دفعہ کہہ دیا کافی ہوگا اس طرح ہو سکتا ہے کہ مالک کو غصہ آجائے۔ وہ انتظار کرتا رہا اور شام ہو گئی، شام کو اُس کا بابو اکیلا ہی کہیں چلا گیا جوگندر بیچارہ کچھ نہ بول سکا اور پھر اُن کا واپسی کا وقت آگیا لیکن اُن کا مالک نہ آیا۔ آخر وہ اپنے چاچا کے ساتھ گاؤں واپس آگیا۔

اُس نے راستہ میں چاچا سے ذکر کیا تو اُس کا چاچا ہنس کر کہنے لگا۔ "اے آج ہی مرنے لگے ہو، جس دن خود ہی مالک کا دل چاہیگا تمہیں سیر کرا لائے گا۔" جوگندر خوش ہو گیا۔

جوگندر بڑی بے تابی سے اُس روز کا انتظار کرنے لگا جس روز وہ کار میں بیٹھ کر سیر کریگا لیکن وہ دن نہ آیا۔ وہ روزانہ یہ سوچکر گاؤں سے آتا کہ آج کار میں بیٹھے گا لیکن ہر روز ہی اُس کا مالک چپکے سے اپنے کام پر چلا جاتا اُس نے کبھی جوگندر سے کوئی بات ہی نہ کی اور پھر اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز وہ کوئی کام کر رہا تھا کہ باہر "پوں" کی آواز سُنائی دی۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہ وہی کار ہے جو اُس نے سب سے پہلے دیکھی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا باہر گیا تاکہ اُس خاکی کپڑوں والے سے کہے کہ وہ اُس کو کار میں بٹھا لے۔ باہر جا کر دیکھا تو وہ کوئی اور کار تھی۔ اُس میں سے تین چار خاکی کپڑوں والے نکلے لیکن اُن میں وہ خاکی کپڑوں والا نہ تھا جس نے جوگندر کی بات مان کر "پوں" کیا تھا۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ سیٹھ نے اپنے نوکر کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور اُسے لاکر خاکی کپڑوں والوں کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے اُس کے ہاتھوں میں زنجیریں پہنائیں اور کار میں لے کر بیٹھ گئے اور پھر کار شوں فوں کرتی ہوئی چلی گئی۔

جوگندر بہت حیران ہوا۔ اُس نے سوچا کہ سیٹھ کا نوکر خوب ہے یہ سیٹھ کی کار کے علاوہ اور لوگوں کی کاروں میں بھی بیٹھتا ہے لیکن اب اُسکے دل میں یہ خلش تھی کہ بھلا یہ خاکی کپڑوں والے آدمیوں کے ساتھ کہاں گیا ہے۔ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے اُس نے اپنے چاچا سے پوچھا۔

"بیٹا اس نوکر نے چوری کی تھی اور اب اُسے جیل لے جایا گیا ہے۔"

جوگندر نے سوچا کہ اگر وہ بھی چوری کرے تو اس طرح اُسے بھی خاکی کپڑوں والے کار میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اس خیال سے وہ خوش ہوا اور اُس نے اپنے دل میں چوری کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

اپنے مالک کے گھر سے چوری کرنے کی ہمت اُس میں نہ تھی لیکن اب وہ ہر وقت اس سوچ میں گُم رہتا کہ کہاں چوری کرے۔ اُس نے اپنے گاؤں کے اکثر لوگوں سے مسجد سے جوتیوں کی چوری کے متعلق سُنا تھا چنانچہ اُس نے کسی مسجد سے جوتیاں اُٹھانے کا ارادہ کرلیا۔ اور پھر ایک روز جب نماز ہو رہی تھی وہ مسجد میں داخل ہوگیا اور جلدی سے ایک جُوتی اٹھا کر باہر کو لپکا۔ ساتھ والی گلی میں مُڑ گیا اور گلیوں میں سے ہوتا ہوا اپنے گھر جا پہنچا۔ اُسے کسی نے پکڑا ہی نہیں۔ وہ بہت پریشان ہُوا لیکن کچھ نہ ہو سکا۔ اُس نے سوچا شاید اُس نے چوری غلط کی ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے کسی اور چیز کی چوری کرنے کی ٹھانی اور آخر ایک روز ایک دکان سے سودا لیتے ہوئے دکاندار کی نظر بچا کر ایک باٹ اُٹھا لیا۔ دکاندار کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ گھر آکر اُس نے باٹ دکھ دیا لیکن اپنا مطلب پورا نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ آخر اُس نے چاچا سے ہی پوچھا کہ سیٹھ کے نوکر نے کیا چوری کی تھی۔

"بٹیا اُس نے سیٹھ کی تجوری میں سے روپے چوری کئے تھے۔"

اب جوگندر کو سمجھ آگئی کہ روپے چوری کرنیوالوں کو خاکی کپڑوں والے کار میں بٹھا کر لیجاتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے روپوں کی چوری کرنیکا فیصلہ کرلیا اور چوری کرنے کیلئے اُسکی آنکھیں آجا کے اُسی باٹ والی دکان پر آرکیں اور ایک روز جب دکاندار دکان کے پچھلی طرف سودا لینے کے لئے گیا تو اُس نے تجوری میں ہاتھ ڈال کر بہت سے نوٹ پکڑ لئے اور ابھی ہاتھ باہر نکالنے کو ہی تھا کہ دکان دار مُڑا اور پوچھنے لگا "کیوں کاکا کتنے چاول؟"

لیکن جب کاکے کا ہاتھ تجوری میں دیکھا تو بھاگا ہُوا آیا اور اُس کے کان پکڑ کر خوب لگائیں۔ جوگندر کی چیخیں سُن کر کچھ لوگوں نے منع کرنا چاہا تو دکاندار نے اُسکی چوری کے متعلق بتا دیا۔ جوگندر نے بہت مار کھائی اور اس انتظار میں رہا کہ ابھی اُسے خاکی کپڑوں والے کار میں بٹھا کر لیجائیں گے۔

"پولیس کے حوالے کرو سالے کو۔" مجمع میں سے کوئی شخص بولا۔

"چھوڑو یار اتنے سے لڑکے کو پولیس کے ہاتھ کیا چڑھانا۔"

"ارے ایسے ہی بڑے ہو کر ڈاکو اور اچکے بنتے ہیں۔"

"لیکن اِسے مار پڑی ہے کہ بچہ جی سُدھر جائے گا۔" ایک اور آواز آئی۔

اور پھر چند اور تھپڑ مارنے کے بعد اُسے چھوڑ دیا گیا۔ جوگندر کار پر پھیرا ہُوا ہاتھ دوسرے ہاتھ پر پھیرتا ہُوا چل پڑا۔

وہ بہت حیران تھا کہ اُس نے سیٹھ کے نوکر کی طرح روپوں کی چوری بھی کی لیکن خاکی کپڑوں والے اُسے کار میں بٹھا کر لیجانے کے لئے نہیں آئے۔ اُس نے سوچا شاید ابھی آجائیں۔ اور اسی سوچ میں گُم چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار کار نے ہارن دیا۔ "پوں" ہُوا تو اُس نے جلدی سے سر اُٹھا کر دیکھا کہ شاید خاکی کپڑوں والے اُسے لینے کے لئے آگئے ہیں۔ اُس نے ہنس کر کار کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اُس کے سر پر آگئی تھی۔ اب اُسے سمجھ آگئی کہ وہ کار کے نیچے آرہا ہے۔ وہ بھاگ کر کار کی زد سے نکلا اور پیچھے سے آنیوالی کار کی تیزی نے جوگندر کی تیزی کو کُچل دیا۔ کار رُک گئی، کار میں بیٹھنے والے لوگوں نے جوگندر کی نبضیں ٹٹولیں، پھر اُسے اُٹھا کر کار میں ڈالا لیکن اتنی دیر میں جوگندر کا کار پر پھیرا ہُوا ہاتھ دوسرے ہاتھ پر پھرتا ہُوا ساکن ہو چکا تھا اور پھر کار جوگندر کے مُردہ جسم کو لیکر ہسپتال کی طرف اُڑ رہی تھی ——!

انعام ہاشمی
بی۔اے (سال دوم)

یادِ رفتگاں

ہمارے کالج کی چند مایۂ ناز ہستیاں جو ہم کو داغِ مفارقت دے چکی ہیں لیکن جن کے کبھی کبھار کالج میں ورود کا خدشہ رہتا ہے
اگرچہ اِن شخصیات کے بارہ میں مجھے لب کشائی کرتے کچھ ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے لیکن افادۂ عام کے لئے پیشِ خدمت ہیں۔

اُدیب۔ج صاحب

اِن کی پیدائش کے بارہ میں اکثر مؤرخین میں جھگڑا رہا ہے اور خیال ہے کہ یہ جھگڑا چلتا چلا جائے گا۔ پیدائش کا دن نکالتے وقت اکثر مؤرخین میں جمع تفریق کا فرق رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اِن کی پیدائش کا دن بُدھ بتاتا ہے یا پھر پیر کا دن!
..... میری نگاہ میں پیر کا دن زیادہ موزوں ہے کیونکہ پیر کے دن پیدا ہونے والا عموماً پیر و مرشد والی عادات رکھتا ہے اور اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ بھی پیری مریدی کا سلسلہ رکھتے ہیں۔ اور ویسے بھی گول چہرہ، مُشت بھر داڑھی اور پیر و مرشد والا جُبّہ اِسی بات کی غمّازی کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے فکر (بلکہ قید و بند) سے آزاد ہیں ـــــ اگرچہ ابھی تک "فارغ البال" نہیں ہوئے۔
آپ اتنے زیادہ دُبلے پتلے ہیں کہ ایک دفعہ دیکھنے کے لئے دو دفعہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اِسی لئے اکثر کالی اچکن پہنے رہتے ہیں کہ جلدی نظر آجائیں۔
عینک لگاتے ہیں، اگرچہ عینک کے بغیر بھی حدِّ نگاہ تک کلاس میں بیٹھے ہوئے شاگردوں تک پہنچ سکتی ہے لیکن پھر بھی شاگرد اکثر اودھم مچاتے نظر آتے ہیں۔
مطالعہ کا بہت شوق ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اُن کے گھر کے سامنے ردّی خریدنے والوں کا ہجوم رہتا ہے اور کباڑیوں کی دکانیں آباد ہو چکی ہیں۔ اکثر دکانوں سے خرید کی ہوئی اشیاء ان کے ردّی کے کاغذات میں بندھتی ہیں۔ یہ قومی نقصان نہیں ہے بلکہ اگر ان کی یہ ردّی نہ ہو تو پھر دکانداروں کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔
آپ کے شاعر ہونے کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بالکل غلط ہیں لیکن بعض کے متعلق کچھ کہا نہیں جاتا کیونکہ ان کی صحت پر یقین نہیں ہے۔

شادی کے بارہ میں دبی زبان سے اپنا بیان کر دیتے ہیں۔ اگرچہ میرا اس سلسلہ میں لب کشائی کرنا مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اس بارہ میں گزشتہ سے پیوستہ المنار کے شمارہ میں "ضرورت ہے ضرورت ہے" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں آپ نے بیوی کے انتخاب کے بارے میں عجیب و غریب ماپ تول پیش کئے۔ خدا کرے وہ آپ کے انتخاب پر پوری اترے ..... اگرچہ عرصہ گزر گیا ہے کہ یہ صاحب ماں باپ کو اپنا سفید سر دکھاتے رہے ہیں کہ شاید ماں باپ اسی بہانے شادی کر دیں۔ مگر ماں باپ یہی جواب دے کر خاموش کر دیتے ہیں۔ بیٹا فکر نہ کرو کچھ روز اور عیش کر لو۔!!

نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو ہمیشہ نظریں نیچی کر کے چلتے ہیں۔ اکثر لوگوں سے سائیکلوں والوں سے اور موٹروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے ہیں۔

آپ نے اپنے تعلیمی دور میں کئی مقالے لکھے ہیں۔ پشاور کی سرد آب و ہوا کے باوجود آپ وہاں کے آل پاکستان مقالہ نویسی کے مقابلہ میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔

آپ کو فخر ہے کہ آپ کا نہ کوئی دشمن ہے اور نہ کوئی دوست۔ المنار کے ایڈیٹر بھی عرصہ دراز تک رہ چکے ہیں۔

د۔ د۔ ز صاحب

آپ کا سن پیدائش بھی ایک راز ہے جو راز ہی رہے گا۔ اتنا معلوم ہے کہ آپ قادیان کی پیداوار ہیں۔

اوائل جوانی میں (لگاتار سگریٹ اور چائے نوشی سے) کافی بیزار رہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ عادت بھی پڑ گئی۔ ایک دن اچھے بھلے بیٹھے تھے کہ نہ جانے کیا ہوا وکیل بن گئے۔

آپ بے حد پریکٹیکل انسان ہیں۔ ۵۶ء میں غالباً میٹرک کیا۔ چونکہ میٹرک کر چکے تھے اس لئے بی۔ اے بھی کرنا پڑا۔ اور جب بی۔ اے کر لیا تو لاء کرنے چلے گئے۔

لاء کراچی سے کیا ہے لیکن چونکہ داڑھی نہیں ہے اس لئے لوگ مقدمات کے سلسلہ میں آپ کو ایک نوجوان سمجھ کر آپ کے پاس نہیں آتے۔ اور اسی لئے اب داڑھی رکھنے کی فکر میں ہیں۔

باسکٹ بال کے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ اگر ان سے ساتھی کا سکور ۲۰ سے اوپر ہوتا ہے تو یہ بھی دو سکور کا خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔

آپ کو فخر ہے کہ آپ المنار کی ایڈیٹری ایک سال تک کرتے رہے ہیں۔ وضعداری کے پابند ہیں۔ کوئی بلائے تو دیر سے پہنچتے ہیں، اکثر آتے ہی نہیں۔ اسی لئے لوگ آپ کو تقریبوں میں اسی وجہ سے بلاتے ہیں کہ آپ آئیں گے نہیں۔

شادی کے بارہ میں دبی زبان سے اپنا بیان کر دیتے ہیں۔ اگرچہ میرا اس سلسلہ میں لب کشائی کرنا مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اس بارہ میں گزشتہ سے پیوستہ المنار کے شمارہ میں "ضرورت ہے ضرورت ہے" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں آپ نے بیوی کے انتخاب کے بارے میں عجیب و غریب ماپ تول پیش کئے۔ خدا کرے وہ آپ کے انتخاب پر پوری اترے ..... اگرچہ عرصہ گزر گیا ہے کہ یہ صاحب ماں باپ کو اپنا سفید سر دکھاتے رہے ہیں کہ شاید ماں باپ اسی بہانے شادی کر دیں۔ مگر ماں باپ یہی جواب دے کر خاموش کر دیتے ہیں۔ بیٹا فکر نہ کرو کچھ روز اور عیش کر لو۔!!

نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو ہمیشہ نظریں نیچی کر کے چلتے ہیں۔ اکثر لوگوں سے سائیکلوں والوں سے اور موٹروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے ہیں۔

آپ نے اپنے تعلیمی دور میں کئی مقالے لکھے ہیں۔ پشاور کی سرد آب و ہوا کے باوجود آپ وہاں کے آل پاکستان مقالہ نویسی کے مقابلہ میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔

آپ کو فخر ہے کہ آپ کا نہ کوئی دشمن ہے اور نہ کوئی دوست۔ المنار کے ایڈیٹر بھی عرصہ دراز تک رہ چکے ہیں۔

د۔ د۔ ز صاحب

آپ کا سن پیدائش بھی ایک راز ہے جو راز ہی رہے گا۔ اتنا معلوم ہے کہ آپ قادیان کی پیداوار ہیں۔

اوائل جوانی میں (لگاتار سگریٹ اور چائے نوشی سے) کافی بیزار رہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ عادت بھی پڑ گئی۔ ایک دن اچھے بھلے بیٹھے تھے کہ نہ جانے کیا ہوا وکیل بن گئے۔

آپ بے حد پریکٹیکل انسان ہیں۔ ۵۶ء میں غالباً میٹرک کیا۔ چونکہ میٹرک کر چکے تھے اس لئے بی۔ اے بھی کرنا پڑا۔ اور جب بی۔ اے کر لیا تو لاء کرنے چلے گئے۔

لاء کراچی سے کیا ہے لیکن چونکہ داڑھی نہیں ہے اس لئے لوگ مقدمات کے سلسلہ میں آپ کو ایک نوجوان سمجھ کر آپ کے پاس نہیں آتے۔ اور اسی لئے اب داڑھی رکھنے کی فکر میں ہیں۔

باسکٹ بال کے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ اگر ان سے ساتھی کا سکور ۲۰ سے اوپر ہوتا ہے تو یہ بھی دو سکور کا خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔

آپ کو فخر ہے کہ آپ المنار کی ایڈیٹری ایک سال تک کرتے رہے ہیں۔ وضعداری کے پابند ہیں۔ کوئی بلائے تو دیر سے پہنچتے ہیں، اکثر آتے ہی نہیں۔ اسی لئے لوگ آپ کو تقریبوں میں اسی وجہ سے بلاتے ہیں کہ آپ آئیں گے نہیں۔

س۔ش۔ص صاحب

حساب بالکل نہیں جانتے۔ اکثر سولہ دُونے آٹھ کہتے ہیں۔ حساب سے یوں بھاگتے ہیں جیسے چور کی داڑھی سے تنکا۔
اکثر یہ مرزا رشید گورگانی کا یہ شعر گنگناتے رہتے ہیں ؎

ہم سے اللہ بھی لے گا نہ قیامت میں حساب
کیونکہ دنیا میں ریاضی نہیں آتی ہم کو

غالباً ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ اگر ۴۱ یا ۴۲ میں بھی پیدا ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔
کانی ہاؤس کے مباحثوں میں عموماً سرگرمی سے لیتے رہے ہیں۔ جگہ جگہ جوشیلی تقریریں کرتے رہے ہیں۔ آخر آپ کامیاب ہوگئے اور المنار کی ایڈیٹری آپ کے دائرۂ اختیار میں ۲ سال تک رہی ہے۔
مقالہ نویس بھی رہ چکے ہیں۔
آپ کا مضمون "مکھیوں کی کانفرنس" جو گزشتہ سے پیوستہ المنار میں ان ہی کی زیر نگرانی چھپا تھا پڑھتا رہا ختم نہ ہوا۔ لیکن میرا دماغ ختم ہوگیا۔ کچھ پلّے نہ پڑا (سوائے مکھیوں کے)

ط۔ظ۔ع۔غ صاحب

ان کی حالت عموماً نارمل رہتی ہے۔ جھوٹ بولنے کے خاص ماہرین میں سے ہیں۔ جدید قسم کا جھوٹ بولتے ہیں اور پھر ڈکار لئے بغیر نگل جاتے ہیں۔ نہ جانے ہضم کیسے کرتے ہیں؟
کھیل سے بہت زیادہ محبت ہے۔ والی بال کے مشہور کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ کیپٹن کا اعزازی امتیاز بھی حاصل کیا ہے۔ یونیورسٹی کے اکثر مقابلہ جات میں حصّہ لیتے رہے ہیں لیکن انتخاب میں نہیں آسکے۔ ان کا حصّہ لینا ہی کیا کم تھا؟
اب جو کوئی امید نظر نہ آئی تو افریقہ بھاگ گئے۔ شاید وہاں اپنی دھاک بٹھائیں گے !!

ق۔ک۔ل صاحب

لطائف سُنانے میں خاص طور پر مہارت رکھتے ہیں (سکّھوں کے اپنے نہیں)۔ اداکاری کے سلسلہ میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں اسی لئے ابھی تک ہیرو نہیں بن سکے۔ چوبیس گھنٹوں میں سے ۱۵ گھنٹے سوتے ہیں۔ اور اتنے زور سے خراٹے لیتے ہیں کہ خود ہی جاگ اُٹھتے ہیں ——— آجکل تھانیداری کے چکّر میں ہیں خدا خیر کرے !!

عطاء المجيب راشد

ايم اے الدرجة الاولى (عربى)

مسئلة التقدير

—:o:—

الايمان بالقدر خيره و شره

—:o:—

مسئلة القدر خيره وشره جزء من الايمان الاساسى فى الاسلام - و معنى هذه العقيدة ان الله تعالى خلق هذا العالم و قد احاط علمه تعالى بكل شيئ على وجه الارض وما تحتها ، بادياً كان ذالك الشيئ او مستورا ، موجوداً فى اى زمن كان — والمسلم لاجل هذه العقيدة يوقن بان الله تعالى ، لعلمه الواسع المحيط ، يعلم مصير كل رجل يمشى على الارض وهو ايضاً يعلم عواقب افعال كل انسان يقضى حياته فى هذا العالم.

قال الله تعالى :

" انا كل شيئ خلقنه بقدر " (القمر ٤٩)

ثم قال عز وجل :

" خلق كل شيئ فقدره تقديراً " (الفرقان ٢)

ولكن مع هذا العلم وقدره تعالى كل رجل مختار فى امره - وعلم الله و قدره لا يحول بينه و بين اعماله و افعاله لان الله تعالى خلق الانسان فى احسن تقويم و وهبه الارادة والنية ، وعلم الله تعالى وقدره مطابق لافعال الانسان وعزائمه - و معنى ذالك بانه يمكن للرجل الشقى ان يتوب عن سئياته وان يعمل عملا حسناً و يكون من خيار الناس - والله يعلم منذ الازل بتقلب رجل من الشقاء الى السعادة او من السعادة الى الشقاء كيفما كان الامر كائناً -

قدجاء فی التنزیل ان کل مومن یقول لربه تعالی :

”ایاک نعبدو ایاک نستعین ،، (فاتحة ٥)

هذه الآیة الکریمة تدل علی حریة الانسان فی افعاله و اعماله لانه یقول اللهم انا نعبدک بالاختیار والرغبة ولکننا لا نستطیع ان ننال رضاک بمحض تدبیرنا فقط بل نحن فی حاجة شدیدة الی نصرتک و عونک فنلتجئی الیک ونستنصرک بان تهدینا صراطک المستقیم -

وخلاصة هذا البحث ان الله تعالی قد احاط بکل شیئ علماً ولکنه وهب الخیار لکل انسان فی اموره خیرها و شرها وجعل له الاجر والجزاء طبق اعماله. هذا والانسان یحتاج الی نصرة الله تعالی فی جمیع افعاله لانه ضعیف لا یقدر علی شیئ الا باذنه و قد اعطاه الله قدرة و سخرله ما فی السموات والارضین - فالانسان حر طلیق لافعاله فی دائرته المحدودة و مثله کمثل الثور حبسه مالکه بمقود ووتد وهو یدور حول الوتد ولا یستطیع ان یخرج من دائرة المقود - فنحن نستطیع ان نقول انما التدبیر و التقدیر هما نهران جاریان متقابلان لا یبغیان ولیس بینهما تناقض و مشادة -

ان الله تعالی قد قدر کل شیئ وهو غالب علی امره وهو علی مایشاء قدیر- والله تعالی رحیم ودود ذو رحمة عظیمة ، لامقطوعة ولا ممنوعة ، لعباده المنیبین- ولاجل ذالک کثیراً ما یبدل القدر حین یدعوه الانسان المضطر و یطلب رحمته - فیجب علی الناس ان یومنوا بقدرة الله تعالی و علمه و ان یکونوا لایزالون یطلبون رضاه ونصرته و کل حسنة فی الدارین -

سعيده حسن
ايم - اے الدرجة النهائية (عربى)

زهير بن ابى سلمى

نشاء زهير بن ابى سلمى ربيعة بن رباح المزنى فى اقارب ابيه - و لزم بشامة بن الغدير خال ابيه - و كان رجلا ذا راى وفطانة - تأثر زهير بعلمه و حكمته و لذالك شعر زهير عريق فى الحكمة - وهو يعد من الفحول الثلثة - و فى الناس من يفضله على امرى القيس والنابغة للوجوه الاتية -

(١) شعره يمتاز بصدق الحجة و خلوه من الحشو والتعقيد -

(٢) يجمع الكثير من المعاني فى قليل من الالفاظ -

(٣) وهو منفرد فى الشعراء فى اجادة المدح و ضرب المثل و ارسال الحكمة -

(٤) و زهير من عبيد الشعر الذين تعملوه و نقحوه تنقيحا كاملا -

(٥) وله قصائد تعرف بالحوليات يزعمون انه كان ينظمها فى اربعة اشهر ويهذ بها فى اربعة فى ثم يعر ضها على خاصة الشعراء فى اربعة فلا ينشدها الناس الا بعد حول -

(٦) و ابوه و خاله و اختاه سلمى و الخنساء و ولداه كعب و بجير من الشعراء المذكورين و ذلك ما لم يكن لغيره -

(٧) قال ابن عباس سئلنى عمر " أنت تحفظ شعراً لاشعر الشعراء ؟،، قلت من هو - فقال من يقول هذا -

ولو ان حمداً يخلد الناس أخلدوا
و لكن حمد الناس ليس بمخلد

قلت هذا قول زهير . فقال " نعم انه اشعر الشعراء،، قلت كيف -

قال لا يستعمل الالفاظ بتعقيد فى اشعاره وهو اول من فتح باب الامثال فى ابياته - كما قال -

لسان الفتى نصف و نصف فؤاده
فلم يبق الا صورة اللحم والدم -

(٨) سئل احنف بن قيس من أشعر الشعراء؟ قال زهير . قال معاوية - لم - فاجاب - كان زهير على جدته رحب الا ناة وراجح الحصاة - سديد الرأى - شديد الورع - مؤثراً للسلم مومناً بالله و اليوم الآخر - يشهد بذالك قوله

فلا تكتمن الله ما فى صدور كم
ليخفى و مهما يكتم الله يعلم

موضوع معلقته مدح الحارث بن عوف وهرم بن سنان المريين على سعيهما للصلح بين عبس و ذبيان - ولكنه فتحها على دستور الجاهلين بالوقوف على اطلال الا حبة و تحيتها . و وقف على الدمن البكم الدوارس من ديار ام اوفى بعد ان اتى على عهده بها عشرون سنة فلم يعرفها الا بعد مشقة و قال :

فلما عرفت الدار قلت لربعها
الا انعم صبا حا ايها الربع واسلم

ثم عاد الى رجليه فمضى فى مدحهما - ثم غلبت عليه نزعة الانسانية و الطبيعة الفلسفية - ثم وقف موقف الحكيم يفكر فى الموت و يعظ بالتجارب و قال :

رائيت المنايا خبط عشواء من تصب
تمته و من تخطئى يعمر فيهرم -

AL-MANAR

JAN., FEB., MARCH

1964

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College

RABWAH

Jan., Feb., March 1964

Staff Editor

HAMID AHMAD CHAUDHRY M.A.

Editors

PARVEZ C. HOSSEN
KHALIL-UR-RAHMAN
MAHMOOD AHMAD

CONTENTS

1. Editorial ... 1
2. Kindness to Parents. ... 3
3. Allah Sees Hearts ... 6
4. Why Swine's flesh is Prohibited. ... 8
5. The Islamic Fast. ... 9
H. U. Khan
6. Religion Defends ... 15
Nasir Azampuri
7. Sun—the Giver of Life ... 17
Mohammad Arshad
8. Story of My Failures ... 22
Junaid Hashmi
9. Glimpses of Africa ... 27
H. M. Khan
10. Letter Openers, Club ... 33
Aftab Ahmad
11. How to Study so that you don't Forget ... 35
12. An Incomplete Story ... 37
M. Zakaria
13. Renaissance in Islam ... 39
Parvez C. Hossen
14. Our Quiz Feature ... 45
15. Answers to Our Quiz Feature ... 46
16. Islamic Concept of Nationalism ... 47
I. H. Qureshi

Two Arabic Articles

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and Published by A. R. Junaid Hashmi
for Talim-ul-Islam College, Rabwah.

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

Vol. XIII	Jan., Feb., March, 1964	No. 2

EDITORIAL

Editing a magazine is not an easy task, especially when there are very few people to write and the editor's choice is restricted by multifarious considerations. Our magazine is not meant to satiate the baser cravings of the reader, nor does it provide much of cheap humour, Whereas we admit that a college magazine should be lively and should contain light atricles, let us not forget that Talimul Islam College is not founded to follow the routine and traditional path and to impart merely secular education. Instead, we mean to educate our students in at least fundamentals of Islam too, so that when they leave the college to enter practical life they should not only be successful men of the world but also good Muslims. We believe that there

is no better instruction than the Holy Quran and there is no better explanation of the holy book than the Hadith and the writings of the Promised Messiah. That is why we have decided to devote some pages for these, and wish to make it a permanent feature of this magazine. The same policy accounts for the inclusion of so many articles pertaining to religion.

As has already been pointed out we are conscious of the fact that light articles and refined humour are also as necessary for Almanar as essays on technical subjects, but we regret to reiterate our complaint that our students and most of the worthy teachers do not fully co-operate, without which the magazine will never come up to our wishes and their expectations. Unless the students take pains to write for it and the teachers encourage them by guiding and correcting what they write the magazine shall not fulfil its proper functions.

Kindness to Parents

وقضى ربك الا تعبدوا اياه وبالوالدين احسانا ، اما يبلغن عندك الكبر احدهما او كلهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما و قل لهما قولا كريما ـ

Thy lord has commanded, 'Worship none but Him, and show kindness to parents. If one of them attain old age with thee or both of them, never say unto them any word expressive of disgust nor reproach them, but always address them with excellent speech'.

COMMENTARY :

With this verse begin those principles and rules of conduct by observing which a people can preserve the integrity of their organization and make it safe against disintegration and decline.

In this connection pride of place is given to the maintenance of belief in the Unity and Oneness of God and refutation of *Shirk* (setting up equals with God), because it is in the heyday of their glory and splendour that a people fall a prey to superstitious ideas and idolatrous practices. In fact *Shirk* is at the root of all sins. Man sins because he lacks true faith in God and His attributes. Belief in the Unity of God is like a seed out of which grow all virtues. It is the pivot round which the teachings of all religions and codes of morality revolve. This belief constitutes the basis and the foundation for both the law of nature and of *Shariat*. That the Law of *Shariat* is based on belief in the Unity of God is too patent a fact to need any explanation; but even the law of nature and all scientific progress are also based on it. For if it be supposed that there are more

gods than one, it necessarily follows that there is more than one law of nature. But in the absence of one fixed and uniform natural law of all progress science will have come to an end, because all the discoveries and inventions made by science are due to the belief that an ordered, fixed and unchangeable system pervades the whole universe. Whithout such a belief man could never have devoted his attention and labour to fathom the secrets of the unknown.

The second most important precept laid down in the verse under comment concerns man's moral conduct. His obligations towards his parents form the most important part of it, because it is the parents who first of all direct our attention to God. It is in the parental mirror that the divine attributes of Mercy, Compassion, Love and Providence are reflected and on a minor human scale are given practical expression. They point to the Being from Whom all things take their origin. The long chain of man's parentage shows that his existence is not the result of mere accident or chance. It turns our thoughts to the Great Originator and Creator. It also shows that a great and noble purpose underlies the creation of man.

The commandment given in relation to God is negative. Man is told that as it is not possible for him to make a return of God's favours, he should at least refrain from *Shirk* (setting up equals with him). In the case of parents, however, he is given a positive commandment, because he is in a position to return their love and kindness, though only very inadequately. So he is commanded to be generous to them.

The words, *with thee*, are significant. They show that when the parents of a person are dependent on him and live with him, he must be specially on his guard against using any harsh words about them. The words have been added because when a man's parents are living with him, there is

always the liklehood for differences to arise and consequently for the embitterment of mutual relations. Moreover, when a person spends his money for another he is inclined to think that he has a right to exercise his authority over him. The Quran therefore has emphasized that extra care should be taken in our relations towards our parents.

In Arabic the word اف (*uff*) is used to express one's disgust by words of mouth and نہر (*nahr*) is used to express it by an actual deed. So by the combination of these two words in this verse the Quran means to say that we should never speak harshly to our parents, much less act unkindly towards them.

(*from the commentary on the Holy Quran by Hazrat Khalifatul Masih II.*)

Encomiums

The Editorial Staff of Al-Manar is to be highly commended for following a very liberal policy, especially with regard to publishing corrective articles and accepting wise counsels, which is very difficult in these days when people, with a few exceptions, try to move with the winds, for one reason or the other. In so doing, they are faithfully and conscientiously acting upon the true Islamic principles of negative and positive virtues, as the combination of both ensures the path of rectitude and piety.

Amorous & passionate articles which undermine sober thinking and true incentive for pious actions are also being gradually eliminated, while others pertaining to moral and spiritual values are par excellence. It is sanguinely hoped, that the magazine will, very shortly, attain the position of a very high order. Amen ! (Dr. M. Ramazan)

Allah Sees Hearts

عن ابى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
ان الله لا ينظر الى صوركم و اموالكم ولكن ينظر الى
قلوبكم و اعمالكم (مسلم)

Narrated by Hazrat Abu Hurairah, Allah be pleased with him : "Said the prophet of Allah, (peace be on him and blessings of Allah), "Allah does not see towards your shapes and your wealth but he sees towards your hearts and your actions."
(*Muslim*)

Explanatory note :-In this *hadith*, the Holy Prophet (peace be on him and blessings of Allah) has mentioned two things which, inspite of being gifts of God, can and become, at times, causes of big trial for both men and women. Of these, one is physical beauty and comeliness which becomes, generally for women, a source of great trouble. The second is wealth and affluenee which generally put men to a lot of test and temptation. Citing both these as examples, the Holy Prophet (peace and blessings of Allah be on him) said that while, without a doubt, they were great gifts of God, but Muslims should take note that Allah does not judge the worth of people by His appraisal of the beauty of women or of wealth of men but that He sees towards their heads and hearts which are the source and repositories for human thoughts and feelings and then He sees towards their deeds which are the products of their thoughts and feelings.

The word *Qalb* used in this *hadith* stands both for heart and mind : for *Qalb* literally means the central point of an organism and the heart and the mind are both, in their respective spheres, centres of the bodily organism ; the mind being the centre of overt feelings and the heart that

of spiritual experience. By using the words *Qulub* (hearts) and *aamal* (deeds), the Holy Prophet (peace of Allah be on him and His blessings) in this context, has pointed out that, though physical beauty and material wealth are gifts of God and one should value them, but what God takes note of is the heart (Qalb) of men and their (aamal) actions. It is therefore the duty of every Muslim to seek to improve his mind, heart and actions, instead of taking pride in the gifts of physical beauty and property and worldly goods.

It must be borne well in mind that the Holy Prophet's (peace of Allah be on him and His blessings) admonition that God, the Excellent, watches the heart and deeds of man, means not only that these things will weigh him on the Day of Requittal but that in this world too, real weight is given to feelings of the heart and the motives of the mind and the actions of limbs. The truth is that, once a people are granted the favour that the heads and limbs of its members start operating in the right direction, no power can hinder the courses of its progress nor deprive it of realisation of the highest of values.

(*From Forty Gems of Beauty*)

Why Swine's flesh is prohibited?

Khinzir i.e., a swine, is one of those things which the Muslims have been forbidden to eat. The very name of this foul animal contains an allusion to the prohibition of its flesh. It is a combination of *Khinz* and, *ar*, the first part meaning "very foul" and the second "I see." The word literally means "I see it very foul." The name which God gave this animal in the beginning therefore, points to its foulness. But what is still more wonderful is that in Hindi this animal is known by the name of *suar* which is composed of two words *su*, and, *ar*, the latter part being identical with the latter part of the Arabic word and the former being the exact equivalent of the first part of the Arabic form. The Hindi word, therefore, means exactly the same as the Arabic, i.e., "I see it very foul," the form also remaining Arabic. The Arabic origin of a Hindi word is not surprising, for as we have shown in the "*Minan-ul-Rahman*" **Arabic is the mother of all languages** and its words are frequently met with in all other languages; *suar* is therefore an Arabic word. In Hindi this animal is also known as *bad* meaning bad or foul which is probably a translation of the original Arabic word. It appears that at an early age in the world's history, when separation had taken place, the word *suar* which is the exact equivalent of and synonymous with the still prevalent Arabic form *Khinzir*, was used to signify the name of this animal, and it has kept the original form after the lapse of thousands of years. The Sanskrit form of the word may have changed a little but there can be no doubt that the root is Arabic for it supplies the reason for which the name was given; and word *Khinzir* attests to the truth of the

(*Continued on page 14*)

Habib Ullah Khan M.Sc.

THE ISLAMIC FAST

Fasting is an important worship in Islam. It is prescribed for all Muslims, men and women alike, who reach the age of maturity and are not suffering from any ailment. The Quranic instructions in this respect may be summarized as follows :

1. The prescribed fasting is for a fixed number of days.
2. 'Whosoever of you is present at home in this month (the Month of Fasting), let him fast therein. But whosoever is sick or is on a journey, shall fast the same number of other days. Allah desires to give you facility and He desires not hardship for you and that you may exalt Allah for His having guided you and that you may be grateful ! '
3. 'For those who are able to fast only with great difficulty is an expiation — the feeding of a poor man.....And fasting is good for you if you only know'.
4. 'And eat and drink until the white thread becomes distinct to you from the black thread of the dawn. Then complete the fast till nightfall'!.
5. 'It is made lawful for you to go in unto your wives on the night of the fast. They are a garment for you and you are a garment for them .....And do not go in unto them while you remain in the mosque for devotion'.

(*Al-Baqrah* 184-88).

These, in brief, are the limits and conditions fixed by Allah, and the purpose of these commandments is that man should become secure against evil.

There is nothing new in this institution. Fasting was an important part of worship in all religions and among all people. The Holy Quran itself makes a mention of this and says :

يا ايها الذين امنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون

> 'O ye who believe ! fasting is prescribed for you, as it was prescribed for those before you, so that you may become righteous'.

The very fact that fasting was part of all religions shows that it is an extremely important institution and its utility and value cannot be denied. Unfortunately today some of the so called 'free thinkers' whose sole aim in life is to eat, drink and be merry, are doubtful about its benefits and say that there is no meaning in keeping hungry for such a long time. It simply makes the body weak and renders a man unfit for work both physically and mentally. In the face of this criticism it becomes important to look into the matter rather closely and critically.

In the verses quoted above the aim and purpose of fasting has been pointed out in very clear terms. According to the Holy Quran fasting has been prescribed for man so that he may become righteous. Besides abstaining from food and drink during the hours of fasting, a Muslim has to make a special effort throughout Ramazan to attain high standard of virtue and purity. A Muslim is enjoined to keep aloof from all strifes and quarrels and is forbidden to indulge in anything that is indecent, obscene, illegal or immoral. He is called upon to lead a pure, chaste life as a matter of routine. But during the month of fasting when he has to abstain even from permissible things like

eating and drinking, it should be his aim not to indulge in anything that is forbidden. In short, while fasting, he should be at peace with his Creator as well as with his fellow beings.

What has been said above is enough to justify the institution of fasting and prove its utility. But the importance of fasting is much more than that. According to Islam the aim of life is to attain nearness of God and the purpose of man's creation is that he should serve as a manifestation of God's attributes and should illustrate them in his life. The Holy Quran says :

و ما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

> 'And I have not created the ginn and the men but that they may worship Me (i.e. serve Me and receive the impress of My attributes).

That being the case, everything that enables man to attain his object is most valuable. During the month of fasting a Muslim not only abstains from all forms of evil but also makes a determined and sustained effort to acquire spiritual perfection. He recites the Holy Quran and ponders over it as much as his circumstances permit him to do. He keeps awake in the latter part of the night and offers additional prayers. He seeks God's forgiveness and His mercy by fervent prayers and humble devotion. Thus fasting enables man to lead a life of purity and virtue and draws him closer and closer to his Creator.

Islam is a perfect religion and all its injunctions have manifold advantages for the human race. Fasting is not only beneficial from the spiritual point of view but is also beneficial in many other ways. In the first place it serves as training for hard times and develops patience and fortitude. During floods, epidemics, wars or other national emergencies one has to face extreme hardships and unless peo-

ple are sufficiently trained, the calamities can prove ruinous. Governments train their soldiers only; but Allah desires that every Muslim should partake of this training.

Secondly, when a man resists evil inclinations and subdues worldly passions with a determined effort, the will power is developed to such an extent that it becomes easy for him to carry out all his programmes to completion. Success depends to a great extent upon the development of one's will power. The month of fasting provides an excellent opportunity for such training.

Another important aspect of fasting is that it enables the rich to form some idea of the dire consequences of want and hunger. People born with a silver spoon in their mouth and brought up in the midst of luxuries can hardly understand the pangs of poverty. They do not know what sort of life some of their unfortunate brethren are forced to live. Being provided with all facilities and comforts of life they hardly know anything about the needs and requirements of the poor people. During the month of fasting they have to forego some of these comforts and are made to realize that there are many who are less fortunate than themselves and live from hand to mouth all the year round. This arouses in them a spirit of fellow feeling aud exhorts them to be more mindful of their less fortunate brethren. We are told that the Holy Prophet (Peace and blessings of God be upon him) took special care to give alms during the month of fasting and exhorted his followers to do the same. This shows that Ramazan (the month of fasting) creates an atmosphere of love and sympathy for the down trodden and bridges the gulf between the rich and the poor. This in itself is a great blessing and brings about harmony among different sections of society.

As mentioned above the institution of fasting is a common feature of all religious systems. However, a comparative

study of its aims and the manner in which it is observed among different religions highlights the excellence of the teachings of Islam. The following are some of the distinctive features of the Islamic fast :

1. The object of fasting among other people and other religions is to subject human body to physical torture. This, in their opinion, leads to salvation. Islam rejects this view and clearly points out that Allah does not like to put human beings to unnecessary trouble and is not pleased with their torture. All that He wants is that human beings should learn to rule over their passions and should lead a life of virtue and purity.

2. Among Hindus it is permissible to eat fruits and uncooked vegetables during the fast. Among the Christians there are no restrictions except that the eating of leavened bread and meat is not permitted. These are all incomplete restrictions and do not fully serve the purpose for which a fast is observed. Islam, on the contrary, lays down comprehensive rules and prescribes complete abstention from eating and drinking and from indulging in sexual intercourse.

3. It is rather strange that among other religions the practice of fasting was made compulsory for a particular set of people or section of the society while some were exempted from this worship. Among Parsees fasting is compulsory for religious heads and leaders only, while among Hindus, the Brahmans are exempted from the observance of this rite. Among the Greeks, fasting was prescibed only for the womenfolk. This sort of discrimination has no basis and is obviously falacious. Islam does away with such distinctions and clearly points out that

fasting is obligatory on all.

4. Like all other forms of worship, the Islamic fast is unique in being both individual and collective. The Muslims are expected to fast individually on different days during the year, but during the month of Ramazan all of them must fast, wherever they may be. Collective fasting creates a special atmosphere of devotion, piety and unity of purpose among Muslims. Thus Islamic Fast is an extremely useful institution. It brings man nearer his Creator and enables him to lead a pure, simple life.

(Continued from page 8)

same view. As to the applicability of this sense of the word to the habits of this animal there can be no question. Everybody knows that it is extremely ugly and lives upon filth, and is moreover the most shameless of all creatures. The reason of its prohibition is thus evident. Taken as food its foul flesh will have the most injurious effect upon the body as well as the soul, for we have shown above that food affects the whole external as well as internal system of man. The pre-Islamic physicians of the Greek school also held that the flesh of this animal produced shamelessness. On similar grounds the Holy Quran has prohibited the flesh of animals that die a natural death, for, it also affects both physical health and morals. Animals strangled or killed by a blow are treated like those that die a natural death.

(From the Philosophy of the Teachings of Islam)

Naseer Azampuri

RELIGION DEFENDS

Secular state mongers are usually heard crying that "Religion is the root of all disturbances in the world. The Holy Scriptures are but an anthology of diversified thoughts, ideas, theories, emotions and sentiments. All hatred and contempt is ultimately wedded to religious bias and expediencies. But is it really so? My answer is in the negative".

Religion in itself, cannot be held responsible for this misunderstanding because the essence of religion is peace and brotherhood. It is the wrong understanding of the spirit of religion which is to be blamed. And in this sense, any ideology affecting the life of human beings, religious or of any other sort, is liable to be rendered ineffective in the achievement of its goals.

When we probe into religious philosophy, we find that religion has got three aspects; namely, intuitive, scientific and practical.

This intuitive aspect takes another form—an expressed one. We enter the world of beliefs. Reason comes into operation and scrutinizes the whole skeleton of our theology. After due analysis, reason ratifies what intuition experiences. This makes the second aspect of religion which applies 'Reason' as its tool and removes totally all the complexities in the world of beliefs.

Now the third aspect of religion seeks its way. The teachings of religion are evaluated in the practical life of man and the society of which he is a member. The three aspects are thus satisfied.

This brief discussion about the nature of religion leads us to the conclusion that a true religion manifests all the above-mentioned aspects. Each aspect is to be supported and supplemented by the other. If we neglect one, the whole structure of religion will fall down. It is, however, a pity to note that most of the prevalent religions do not employ all the above-mentioned methods, thus leading to non-coincidence among them and hence making their attitudes towards the religious life of man completely unscientific and unhealthy. More than often they display such phenomena which are utterly irrational and non-sensical. The followers of such religious ideologies should realize the importance of these three aspects, the adoption of which will enable them to reply any philosophy which attacks their religious beliefs.

Islam, being a religion of Reason and enjoying the highest place in the world of practice, is able to face any agression from any circle. Islam ventures to employ Reason to the extent that present or future philosophy can think of. The Holy Quran is full of verses in which we find strong recommendations in favour of Reason.* Verily, Islam is the most perfect, the most scientific, the most realistic and the most appealing religion of the world of today. Let every body test the truth of the statement.

We get instantly stunned and wonder struck. Why this reaction? The key to this 'why' is that we are instinctively perturbed. Something virulent takes place. Something from within ourselves stimulates our innate desire for search—the search of the Hand who made this great universe with all its wonders and complications.

At this juncture, we suddenly become aware of the

(Continued on page 21)

* (Refer to the following verses of the Holy Quran : 2 : 165, 171, 172, ; 5 : 59, 104 ; 8 : 23 ; 10 : 43, 101 ; etc.)

Mohammad Arshed M.Sc.

SUN-THE GIVER OF LIFE

It is no wonder that many people in the world have worshiped the sun, calling it the GIVER OF LIFE, which it most certainly is. Some day rocket ships will blast their way from the earth to the moon. Planets and moons will be explored by the future space-travellers, but the sun will never be.

Today we know a good deal about the sun. Scientists have studied it for over two centuries and are still studying it. They have found out that the temperature at the surface of the sun is 12000°F or nearly four times as hot as melting iron. Nothing on earth could stand such heat. Everything —rocks, soil, the earth itself would be changed into a hot glowing gas.

The temperature at the centre of the sun is probably 20,000,000 °F. No fuel on earth can produce such heat.

If the sun were a soild ball of burning coal, its temperature would have been much less and it would have burned out millions of years ago.

Astronomers once believed that the Sun's shrinking or contraction was the source of its heat. Heat given out by a shrinking sun would be much greater than heat from a burning one. But later, it was discovered that the sun gives out *Thousand Times More Heat* than even a shrinking one could produce. The scientists are now sure that the sun and other stars are tremendous atomic furnaces.

The Sun is *huge*. Had it been a hollow ball, over a million earths could have been dropped into it without

taking up all the room. If the sun were put on an imaginary scale, it would take 332,000 earths to balance its weight. The sun is only one and a half times as heavy as an equal volume of water.

In spite of all our great machines, most of the work of the world is being done by the heat of the sun. This heat makes water evaporate and causes the vapours to go into the air. The air has many millions of tons of invisible water in it. Each year the heat of the sun evaporates enough water to cover the entire surface of the earth to a depth of three feet. When the air is warm it can hold more moisture and when it cools down it holds less. Consequently some of the water in it falls as rain. The rain that falls on the land makes plants grow. It keeps animals alive. It makes brooks, rivers and lakes. We dam up some of the rivers to prevent floods, to produce electricity, and to irrigate the land. All this is possible because the sun's heat causes water to evaporate.

The heat of sun warms the air too, keeping it constantly on the move. The same heat causes all the winds and currents in the oceans. Most of the plants cannot grow when the temperature is less than about 40 °F. In the presence of sunshine plants not only grow, but manufacture their own food from water and carbon dioxide. Plants use sunlight to convert water and carbon dioxide into sugar from which they make starch and other kinds of food.

Sometimes plants which have died and been buried in swampy places slowly change to *PEAT* and *COAL*. We dig this coal and use it to run factories and heat our homes. This is why coal is sometimes called *BURIED SUNLIGHT*—and that is exactly what it is. The petroleum from which *GASOLINE* is made probably came from tiny sea plants which were buried in ancient times. The food these plants made, by

the help of sunlight, was stored as oil and this has slowly been changed into PETROLEUM.

Nearly all the kinds of energy we use for our material and cultural needs are derived from solar energy. The chemical energy of coal, peat or wood, the muscular energy of animal, or of man himself, are all of them solar radiation energy which has undergone a number of transmutation processess on a vast scale.

For a true picture of the sun, we must also compare it with other stars. Our sun is about100 times less brighter than the Blue-white stars and 100 times brighter than the faint-red stars. Sun is just about in the middle. It is of medium - size, medium heat, and not outstanding. But for us it is the most important star in the universe.

No star is as important to us as the one we call 'THE SUN'. Of millions upon millions of stars in the heavens, the sun is the nearest and the brightest. The temperature at the outer surface of the sun is about 6000°F while the temperature inside the sun, though never measured, is probably 20,000,000°F.

Odd as it may seem, the temperature of the sun is too hot to be produced by burning. When coal burns, for example, the carbon, of which it is largely made, joins with oxygen to form a gas called carbon dioxide. Both carbon and oxygen are found at the surface of the sun. But at a temperature of 12000 degrees they have so much energy that they cannot combine together to form carbon dioxide. So the carbon cannot burn. The heat of the sun does not come from burning coal or any other fuel. If the sun were a solid ball of burning coal, its temperature would have been much less and it would have burned out millions of years ago.

The amazing discoveries about atomic energy offer

the best explanation of the sun's great heat. In the sun and stars alike the gas called Hydrogen is changed into another gas—Helium. The change is not simple. Other chemicals, especially carbon, nitrogen, and oxygen may be involved.

A ton of hydrogen does not become a ton of helium. It ends up thirteen pounds less. This loss of weight means that a small amount of the sun's matter has changed into heat and other forms of energy viz. light, X-rays and radio waves. When matter changes into energy in the sun, the loss in weight is small as compared to the energy produced. But because the sun is so tremendous, its loss in weight amounts to four million tons a second. For the sun, this is next to nothing. The sun has been changing matter into energy for billions of years, but still it is so large that it will continue te give us light and heat for billions of years to come. The weight of the sun is 332,000 times the weght of the earth while its volume is more than million times the volume of the earth. Compared to its size, the sun is not heavy. It is only one and a half times as heavy as an equal volume of water. The energy from the sun is called radiant energy, because it radiates out from the sun like heat from a fireplace. Light is visible radiant energy. Other types of radiant energy such as radio-waves, heat waves, X-rays and ultra-violet light are invisible. Ultra-violet light is used to kill germs in the air of hospitals and school-rooms. When milk and other foods are exposed to ultra-violet light, a chemical very much like vitamin-D is formed in them. The electric current inside a fluorescent tube makes ultra-violet light too. This strikes the special chemicals that coat the tube and causes a soft flowing light.

It is hard to realize the amount of energy that pours from the sun year after year and century after century. This energy goes out in space in all directions. Only one

two-billionth of it strikes the earth. Practically all the light and heat of the sun, like that from other stars, is lost in space. Less than half of the sunlight that reaches the earth gets down to the ground. Yet the small amount of energy that does is great beyond telling. The value of the solar energy that the earth receives cannot be reckoned in Rupees. At the cheapest rate for current, the amount of electricity needed to make the energy the earth gets from sunlight would cost many billions of rupees for a single twelve hour day.

(Continued from page 16)

fact that we have not been created without any purpose. The creator has definite purposes behind our creation. We also find that this whole world is full of pain, miseries, grievances, diseases, cruelty, disobedience and hundred and one other evils. We are pinched at this sight and our inner self is made to react in a particular way. The reaction is fairly strong. It grumbles. Let us turn this dreadful scene into a calm, easing situation. Let us make this hell a paradise. We feel fully prepared to accept this grumbling voice — the outcome of our inner reaction. What is responsible for this immediate reaction? This is the first and foremost aspect of religion. We call it the Intuitive aspect.

A. R. Junaid Hashmi

STORY OF MY FAILURES

It was a hot and burning summer day when I was running at top speed on a lonely treeless path from my village to the nearby railway station. The day of announcement of my Matric result had come at last! Beads of perspiration were streaming down my flushed cheeks, and my heart was beating at the rate of 140 per minute. It was a doomsday—the day of judgement and rewards, the day of action and reaction and the day of tears and laughters. Only an hour was left when the high hopes of my mother would be fulfilled and my father's promise to get me admitted in a college was to come true. I was running hard to meet the oncoming train carrying the newspaper of my result. After half an hour's strenuous exercise I reached my destination and started looking down on the result-sheet with flowing nose and tearful eyes, spoiling the whole page in an effort to locate my roll number. My roll number was at the end. I was allowed to re-appear in English Language and was given another chance to clear it in the month of November. I could not gauge my actual feelings as to whether I should weep or smile, suffer or rejoice, dance into the air or jump into a well! Should I go home to break the news to my father or run away by the same train which had brought this news? I stood there like a statue on the lonely platform for a while and then walked home with a heavy heart.

I told my father the true story and convinced him to get me admitted in any college with the promise that 'I shall come up to his expectations with my diligence and hard work in studies, I shall clear English after

three months and will surely improve in my next class.' So within ten days I was ushered in the presence of the Principal and submitted my admission form. He was well known for his sympathetic attitude towards the poor and rejected class of students, so he only corrected the spellings of my name and checked the date of my birth and soon I was enrolled along with scores of others who were put under compartment in English like myself.

Within a few days I was back on my feet; gazed at my classfellows, and selected some of the bright faced youngsters to be my friends. Soon I found myself quite popular and social sort of a fellow among my class-mates and seniors. I had taken up the easiest subjects, and of course Economics as was suggested by one of my seatfellows and which was believed to be not only an easy subject but also beneficial for my future career. After some days I was encouraged and coaxed by bright-eyed companions to take part in "*extra-curricular activities*" of the college, and indulged myself in the ensuing College Union election, and in many and varied programmes of Societies, groups and games.

Thus I passed my days making friends and foes, companions and opponents. I cleared my English in the supplementary Examination obtaining a third division in the second attempt, but this was overlooked like a floating dream. I was immersed head and foot in enjoying my college life. Nothing bothered me more than my dress and hairdo. O! the feel of pencil-thin short trousers, the crested hairdo of intricate swirls and reverse combings! This was done to shock on-lookers and attract attention! We were a gang of so to say "*popular students of the same age and thinking.*" We evaded "*tests*" and examinations under various excuses and pretexts. Similarly by tactful contrivances we got remitted our absence fines. The simplest form of my disgust for study and books was to become absent-minded in the lecture-

room and to look innocently towards our learned professor. A few nods at intervals would easily convince my worthy professor that I was absorbing his deliberations with a receptive mind. As soon as the last bell rang our favourite haunts were the recreation centres, the green, velvety fields or the fine and smooth roads where enthusiasm, thrill, attraction and affection were awakened in my whole body. Well-tailored suits, bright coloured ties, slouched caps and tight trousers gave me a steadying effect.

After two years the doomsday of my labour and toil had to bring fruit. Intermediate final Examination was scheduled to be held in the balmy, sleepy season of April. Suddenly it dawned upon me that I could not make amends for my past fruitless and pointless activities. I must strain my nerves and burn the midnight "*electricity,*" bring the heaven and earth together. I must melt the fat of my stolid body. Now I was like a camel in a limitless desert, a rudderless ship on the wide ocean. I was like a forlorn bird left behind its flock; spurned by fate and ruined by time. I shed tears over my pillow at night and cried in wilderness during daytime! But the onslought of the cruel examination came like a thunderous black cloud over my already dimmed horizon of mind. The Laws of Economics The Law of Diminishing Returns—haunted my intellect and was beginning to show its curve. Other things (*hope of success*) remaining constant, when one factor (*the fear of failure*) is increased there is always a proportionate decrease in the marginal return in satisfaction by each successive unit of foot steps towards the result sheet, until the mind is entirely out of balance and one becomes almost crazy and neurotic". Anyhow I was revising, memorising, and devising all means to get through the Annual Examination. I had become mentally upset; my professors dubbed me as blockhead and half mad.

At last I entered the Examination Hall with a sinking

heart and feverish brain. I did my papers with girded up loins tightly wound up with snake-coloured belt and, through Parker pen, the ink of my ideas poured from the store house of my jammed and crammed up brain. After the examination I remained in the embryo of hopes and fears, expectations and torments, rejoicings and tortures, waiting for the result. Such strange mixture of feelings can only be measured by those whose results hang in a balance. They know their shortcomings.

After the ordeal of Examination I again drowned myself headlong in *extra-curricular activities* and tried to forget the past. But after a few days before the announcement of the results, all the sleeping beauties of college day-dreams suddenly woke up. I could not control my movements. I was excited beyond description. My result was to be declared within twenty four hours. My class-mates had now contacted me and we were again a band of noisy and clamorous fellows. I was encouraged by their faith in me, but I was sluggish and cowardly. Still, I was dragged towards the notice Board. A lively scene met my eyes. The Notice Board was crowded like a bee-hive with students. I jumped into the multitude and craned my neck over the shoulders of a friend and scanned the sheet with my myopic eyes. Oh the horror! My roll-number was missing! I was confused and worried but somebody's clarion voice rose above the din and thundered that I had got compartment in Economics. A current of icy chill ran through my back-bone. I was tongue-tied for a moment but the hope of joining the degree-class ran warm blood through my nerves. Finally I was admitted provisionally in III year, and given four chances to clear the drab, dry and boring subject—Economics.

Now I forced myself to sit on the desk and listen to the lectures with rapt attention and concentration. But the gaudy-coloured shirts, and tightly-fitted trousers again disturbed my pool of determination and soon I was oblivious of my class

and study. I again roamed about the world of my creation, and went astray in my mind. Economics had made me miserable. I was at my wits ends and could not make out the end of my present plight. I had failed thrice in Economics and it was my fourth and the last chance. I was now in IV year, but was still unable to clear this blot of compartment of the Intermediate Examination. Economics had failed me. It had ruined me. I was buried in a thick pall of gloom. I could not sit in my B.A. Examination unless I cleared this bug-bear of a subject which had now become a complex and a nightmare. As soon as I buried my head into the book of Economics, one by one the happy moments spent with cheerful youngsters, the care-free hours in recreations and tea parties, the zealous days spent in lively debates and manifold extra-curricular activities, passed before the eyes of my mind. By and by I lost all self-confidence and tenacy of struggle in life. By the time I sat for the last chance of my Compartment Examination, I was a total wreck. I heard, as expected, that I had failed in Economics for the fourth time, and along with it came an order from the University like a bolt from the blue, that I had to re-appear in all the subjects next time, if it ever comes to my head to join a college.

I had spoiled four precious years of my life without obtaining any degree or even a diploma but still the happy memories of the college life haunt my solitude. Academically I am still a third-class Matric, but when I lay down my tired and belaboured body in the still of the night, on my bed, in a lonely and silent village hut, the vivid and unerasable picture of the past appears to my mind. I can still recollect the "moony trips" on the river-side, the zealous and lively debates, the noisy and clamorous sports, the happy and carefree gossips in tuckshop and the whispers and remarks in class room. Then I place my weary head into the bliss of this strange and dreamy world and soon drown myself into a deep slumber.

Hasan Muhammad Khan
(M.A. Student)

GLIMPSES OF AFRICA

Look at the full moon. Imagine if by some miracle Africa would have been there. Let me tell you it would be five times bigger than it is, and nights would have been considerably brighter. The illuminated face of the full moon is only one fifth of the total surface area of Africa. The face of the moon which we see is only about 22 lac square miles, whereas Africa's area is nearly one crore sixteen lac square miles. This dark continent could become a search light for the earth if it could replace the candle light moon.

Africa is about one fifth of the whole world. It is the second largest continent on earth—only a little smaller than Asia. It could swallow two South Americas. The Sahara alone is larger than the whole of the United States. Ghana, Nigeria, Congo, Tanganyka and the rest, are giants compared with the lilliputian countries of Europe. Lake Tanganyka is the world's largest lake—400 miles broad and nearly a mile deep—exceeded only by Baikal. The Nile is the longest river in the world. Victoria Falls is twice as high and nearly as wide as the Niagara falls of the United States. The Suez canal is the longest ship canal of the world. It is one hundred miles long and twice the length of Panama Canal.

Like a great castle protected by huge walls, surrounded by water moats, Africa does not allow foreign intruders to penetrate the continent. No other part of the world has been so effectively scaled off from invaders. The result is that Africa is a world in itself, and has developed forms and ways of life quite different from the rest on earth.

Its animal life alone is queer and strange and makes it a strange continent. It is the exclusive home of the hippopotamus. Nature created the fantastic giraffe on this great continent. The buffallo of Pakistan is meek, tame and a fine milk giving animal of our household. We are delighted to drink its milk. But in Africa it is regarded as the most dangerous of wild game. The gorilla, largest of the anthropoid apes, is in Africa as is the cleverest and most man-like ape, the chimpanzee.

Most unfortunately this has been the continent which has been supplying the greatest number of slaves to America—the free human labour—and now even this black man of America is striving to break his social shackles. It is one of Africa's incredible contradictions that this continent which gave rise to the first known civilization is now the most backward of all continents. China's recorded history goes back to 2200 B.C. Egypt's story begins more than 5000 B.C. The cradle of civilization was in Africa. The first of the seven wonders of the world is the Pyramids of King Cheops in Egypt built in 4000 years B.C.

There is a large room for a very few people in Africa. The population of the whole of Africa is 225,000,000. This means only nineteen persons to a square mile. In Holland there are 882 people to a square mile, Japan 642, and in England 552. Due to lack of education, people are backward and have not been able to explore the riches of this continent. Beneath the surface, there lie fabulous riches unequalled in any other continent.

Colonialism has been the greatest curse of this continent. It has tremendously helped to enrich the European powers. Ninety percent of the world's diamond comes from Africa. In 1958 Southern Rodesia produced the greatest number of emeralds of purest quality. All the world's cobalt is supplied by Africa. The columbite with which jet planes are flown

is all African. Africa produces the greatest amount of chromium in the whole world.

Huge oil fields have recently been discovered beneath the sands of Sahara. Nine foreign companies from the U.S.A., Canada, and the Netherlands have obtained concession in partnership with French firms. The finest grade of cotton comes from Africa. No other continent supplies as much cocoa as Africa. Half the sisal supply of the world comes from Africa.

Congo is a country situated in south of Central Africa. A great river whose name is also Congo runs through the country. It is the chief highway of both Congos. It is the world's third largest river surpassed only by the Nile and Amazon. Together with its tributaries, it provides 12,000 miles of navigable water for steamers and twice that for launches and canoes. In some places it is twenty four miles wide. It is dotted with more than 4000 islands. When it reaches the ocean it does not quit, but continues to roll a hundred miles out into the sea. Nowhere are tribal customs more primitive than in the Congolese jungle, and yet the Congo drums have carried the news of independence to the last village.

Then there is a huge lake—the Victoria Nianza. Lord Curzon described Victoria falls as "The greatest river wonder of the world". It is twice as high as Niagara in United states and one and a half times as wide. It hurls River Zambesi over the edge of a cliff at 75,000,000 gallons per minute. The average height is 304 feet and the height of the greatest fall is 355. These are really strange facts but the unique thing about this waterfall is its behaviour after it falls.

Facing the waterfall is another cliff equally high with a chasm about 100 feet wide between them. Into this chasm

the water fall thunders. And as you walk along the edge of the cliff for a mile, you pass by the various parts of the great spectacle, the Eastern Cataract, the Boiling Pot, the Rainbow Falls, the Livingstone Island, the Main Falls, the Cataract Island and the Devil's Cataract. And all of them within a stone's throw.

It is not an easy walk. A drenching rain is falling. The wind coming up by the waterfall seems determined to rip the oilskin from your back, and in many places on the path the water from the everlasting rain is ankle deep, and deeper in the mudholds.

The water after crashing on the rocks is blocked by the facing cliff. The down rush has made a strong down-draught of air. There is no place for this air to go except upward on the other side.

So up it comes, carrying the spray with it. It not only rises some 350 feet to the edge of the cliff but keeps continuously going up for another 5000 feet, making the famous pillar of cloud which is the distinctive feature of Victoria. These lofty columns of rising rain can be seen fifty miles away. Interlaced with them are brilliant rainbows.

At last the uprush loses momentum, and down again comes the water on the heads of observers in a torrential tropical downpour of oversized drops tossed about by the conflicting winds from the chasm.

You must have read about Kalahari desert in Africa. There is Bechuanaland. Let us see how the people live there. The Bushmen of the Kalahari are the most primitive of all primitives. A few of them are left. Many were wiped out by the Boers who marched into the Kalahari, killing as they went. But the desert rose up in defense of its people and routed the invaders.

They are small people, about five feet high. Their shoulders are broad, with loose muscles and their legs supple. They can run like wind. When there is no reason to hurry they go at a trot, and hardly seem to know how to walk. They can see distant objects which are quite invisible to ordinary human eyes.

The Bushman is characterised by what the scientist likes to call steatopygia, which merely means that his rump projects like the hump of a camel. It serves the same purpose, acting as a storehouse of fats and carbohydrates ready for use when food cannot be had. When the hunting is good the Bushman's buttocks stand out so far and flat that one could set a glass of water on it.

The other remarkable feature of the Bushman's anatomy is the male sexual organ which stands constantly erect. It stands when the child is born, and it remains erect even when a Bushman of eight years dies. He never hides or conceals this feature of his anatomy. Rather, he exhibits it as a mark of pride, so much so, that his own name for his people is "Qhwai-khwe", the ever standing.

He does not hesitate to tackle the largest animals. He goads an elephant into pursuing him and while the great beast vainly tries to overtake him, one of his companions runs up from behind the animal and cuts the tendons above the heels. This completely disables the great beast so that it can easily be finished with knives and spears.

He uses the lion as a hunting dog. He drives an antelope towards a lion, allows the lion to kill the game and eat part of it, then drives him off and divides the rest of the meat among his friends. He may use the same lion repeatedly and an understanding grows up between the two hunters. The lion becomes familiar and even affectionate,

follows his master like a big cat, and plays the game faithfully so long as he is allowed his share of the booty.

Incidentally he hunts a lady in the same way as he would hunt any other creature. Using a very small bow and arrows tipped with perfume rather than poison, he stalks his intended girl and, when near enough, shoots an arrow into her rump. If she pulls it out and breaks it, he has lost his suit. If she keeps it, he has won a wife.

During the dry season the Kalahari shows no sign of moisture. Any stranger would be doomed to death by thirst. But the Bushman knows where to find the sip-wells —stores of water deep beneath the sand. He inserts a long, hollow reed and drinks. If he wishes to take water back to the camp for his family he lets the sipped water spill out of his mouth into an ostrich shell and in a remarkably short time can fill two of these natural containers with the cool liquid.

Christianity found a fertile field in these unlettered inhabitants of Africa. The missionaries reaped a rich harvest for a long time. Since the beginning of this century some of the evangelists were of the opinion that sooner or later the Cross would rule over the whole of Africa. Muslim Africa was dumb-stricken before this great sweep. But just in the second decade, Ahmadiyya Missionaries spread throughout the East and the West of Africa. Now the tables have been turned. Islam is gaining, in some of the areas, ten converts as compared to one to Christianity. Strong educational units are working in some countries. Missionaries are working feverishly to save this continent from man - worship of Jesus and trying hard to bring the creatures of God under the kingdom of One God which is presented by Islam alone in the modern age.

Aftab Ahmad M.A.

Letter Openers' Club

Ours is an age of democracy and trade-unionism. Every group of "like-minded" people forms itself into a body or a club, gets itself registered and begins to activate the people of the same ilk by enlarging its membership, thereby contributing towards the over-all progress of the country and democracy.

Keeping apace with the times, it is our intention to form a club of the people holding similar beliefs with us, and whose energies are being squandered away at present, for lack of an organised body.

The aims and objects of the club are set down below:-

(1) The name of the club would be the "Letter Openers' Club". It would be a club duly registered with the Government and efforts would be made to obtain some grant from the government in order to make it a "recognised and aided institution".

(2) The membership of the club would NOT be open to all and sundry; only highly educated, civilized and most cultured people would be allowed to become the members.

(3) Every member would be required to open at least two letters a week, of his friends, and read them thoroughly.

(4) Members would be encouraged to snatch other people's letters before the owners could reach them and open and read them before the owners could.

(5) Foreign coaches would be engaged to teach the members the art of looking over the shoulders of

friends while they are reading their letters.

(6) Annual competitions would be held to select "Mr. Letter Opener of the Year", who will be awarded a gold medal whereas the runners up would be given silver and bronze medals. A consolation prize would be offered to the beginner who had done his best in the very first year.

(7) Foreign scholarships would be awarded to the most promising and talented persons and opportunities for advanced training and higher studies in this art would also be provided.

(8) Every year a compaign of "open more letters of others" would be launched to make the club popular and fulfil its aims.

(9) A co-operative branch of the club would be established with the object of encouraging co-operative letter opening and co-operative letter reading.

(10) Highly advanced and newly discovered techniques would be introduced in order to enable the members to wriggle themselves out of any difficult situation.

(11) Efforts would be made to establish a world bank which would provide loans to nations which were yet backward in the art of letter opening.

These are, in brief, the main aims and objects of the club. It is expected that there would be a great rush for the membership. To avoid disappointment and to uphold the traditions of justice and fair-play, a test would be held for selection, whose dates would be announced shortly. Readers are meanwhile informed to keep themselves fit and ready.

Mohammad Arshed M.Sc.

How to Study so that You Don't Forget

(1) To start with, you must have all the materials you need such as dictionary, textbook, pen, ink, etc. right before you so that you don't waste time in gathering them at the last minute.
(2) Time and place should be definite and decided and it should be the same every day,
(3) Be confident in your ability and don't worry.
(4) Practise 'SILENT READING' because only silent reading can help you reproduce the materials silently in the examination hall.
(5) Study with the intention of remembering things even after the exams. In this way you will not forget them before the examination.
(6) Study as if you are learning new facts to discuss them in the society.
(7) Start each new topic with a one-minute review of the previous one and try to find the relation between the two.
(8) Before starting the new topic, skim rapidly over it, noticing headings, topics and illustrations, and then start studying it.
(9) Test your progress after every one or two topics, by reciting the matter learnt.
(10) It is better to read through the whole lesson several times than to master one part at a time.
(11) Understand what you read and criticise it by applying your own thinking.

(12) Associate the new facts and ideas with the ones already in your mind.

(13) Space or distribute your study. Several short periods are better than a few long periods of practice.

(14) The time immediately after learning is the time you forget the fastest. Therefore review a lesson several times a few hours after you have finished studying it. A five-minute summary and review after studying will frequently double the amount of material you will recall.

(15) After you have learnt and understood something pretty thoroughly, keep on learning it a few extra times for good measure. In other words overlearn. OVERLEARNING is necessary to check early forgetting.

(16) Discuss what you have studied with your friends. Think about it at various times during the day while walking, eating, riding and at other suitable times.

(17) Rest for a few minutes after studying a complicated subject.

(18) Review and summarize your day's work as the last thing before you go to sleep.

(19) There should be no entertainment in progress in the form of radio, gramophone, novels etc. immediately before going to bed.

(20) Invent your own methods for remembering things, for these are often better than those supplied by others because they best fit your own personal needs.

Muhammad Zakaria

An Incomplete Story

I do not exactly remember what I was thinking of when suddenly I heard the Professor saying that every student had to write a story. It was really a great problem for me. I have written many things, but never a story.

I started thinking out some plot for the story. It was after a day that I again remembered the task. I jotted down a few plots but did not know how to write the story.

At about 9 0'clock at night I again made up my mind to write it. And I had really a good plot before me. My hero was a teen-ager named Qais. He was very brilliant and brave. One night while he was lying in bed, gazing at the full moon, he felt a strong desire of going there. Suddenly he noticed that the moon was moving towards him and that after an hour or so, it was just near his bed. To his great astonishment, he found that the moon smiled at him and said good morning.

Qais: "Who are you? Are you the real moon?"
Moon: "Yes, I am. I want to be friendly with you. Why don't you come to my place?"
Qais; "Yes, I would like to accompany you. But I don't know how to go there,"
Moon: "Alright, I give you a rocket which will take you to my capital."

So saying, the moon gave a small rocket to Qais. And suddenly he found that the moon was again far in the sky, leaving a small rocket in his hand. He started

testing the rocket but very soon it fell on the ground and as he tried to pick it up. I started writing what happened next. I found that I had hit the table with my forehead.

Just at the moment my neighbour knocked at the door. "What is the time?" he asked. This intrusion disturbed all my thoughts. I was so much occupied with my story that I did not know when I went to sleep. I was no more in a mood to know what happened with my hero. I went to bed. The thought of the story was most painful to me. I was no more interested in knowing what the hero did with the rocket. Did he go to the moon or was he in some trouble like me?

Just then I discovered that the story was not given even a title. So, I started thinking over it and the first title that struck my mind was, "An Incomlete Story".

The Professor took my note book and said "What is this.....two pages only and not yet completed".

"Sir, the title says it is an incomlete story. How can you expect a complete one?", was my innocent reply.

Parvez C. Hossen

RENAISSANCE IN ISLAM

History bears evidence to the fact that the world has gone through several stages of reformation since its creation. The reformation, in its different stages, brought about many changes and modified to a certain extent our concepts of religion, politics, economy and society.

People usually refer to the reformation as the religious and political revolution of the 16th century when Europe emerged out of its deep slumber, commonly known as the Dark Age, into the New Era. This transitional period from the Dark to the modern age is known as the Renaissance. But I do not propose to discuss Renaissance in this technically narrower sense. Instead, I shall deal with an another one of a much wider and fuller signficance which took place in the world of Religion—more exactly in Islam.

Islam is one of the latest religions of the world. In fact it is a perfect and complete code of law. God says in the Holy Quran : "This day have I perfected your religion for you and completed my favour upon you and have chosen for you Islam as religion". The Holy Prophet (peace be upon him) brought us the Holy Quran and expounded its glories to the world. Many were those who felt its veracity and, consequently, embraced the fold of Islam.

The Holy Quran has, since long, been proved to be the only authentic book of revelations and laws which has not been tampered with like others, e.g. the Bible. Hence we, Muslims, are in possession of one of the most important books in the world which can lead us to salvation. But unfortunately we have not given enough of

our time to understand it properly. Muslims have been listening to the *Mullahs*, who have distorted the *Hadiths* and who have given wrong interpretations of the verses of the Holy Quran, so much so, that a large majority of them believe that there will be no prophets after the Holy Prophet (Peace be upon him) except Jesus Christ. In other words these *Mullhas* want us to believe that Almighty Allah has stopped all communications with His creatures. But God cannot let His sheep go astray.

All the religions of the world contain prophecies concerning the advent of a Prophet in this age. Again it is foretold that these promised prophets will propagate the truth throughout the world and that the true religion will manifestly triumph over all other religions. The conclusion is unavoidable that all these prophecies refer to one and the same person who shall, by means of his spiritual powers, gather together men of all faiths, and guide the nations of the world along the right path. So, in fulfilment of these prophecies contained in the Holy Quran, the *Hadiths* and other previous scriptures, He sent us His messenger. And that messenger was none but the Promised Messiah (peace be upon him). He was the one who brought about the promised reformation in Islam. Being divinely guided, He explained to us the true meanings of the word of God.

The birth of the Messiah (peace be upon him) was a landmark in our history. His was a revolutionary period and denoted a certain phase in the developing attitude of the Muslims towards the Holy Book. Hence there is no reason why we should not take it as a reformative stage in Islam. Accordingly our renaissance started from the day the Promised Messiah (peace be upon him) came to the world.

Ahmad of Qadian (peace be upon him) was born on a Friday morning, the 13th of February 1835, and according to Biblical Chronology his birth was in accordance with earlier prophecies.

The persons, who were present on that eventful day, were wonder struck by the divine halo that surrounded the lovely baby In due course he grew into a handsome boy with remarkable traits of piety. Since his early childhood he showed signs that he was not with this world but lived in an atmosphere of purity and was always immersed in holy things.

He received a scanty education under the tutors appointed by his father. He was, moreover, initiatated into the rudiments of medicine by his experienced father.

Days rolled into months and months into years until Ahmad was called upon by God to claim that he was the Promised Messiah. Accordingly he wrote several books viz: *Fateh Islam*, *Tauzih-e-Maram*, *Izala Auham*, to establish his claim, and declared: "I say it over and over again, and nothing can stop me from saying it, that I am the one who has been sent to regenerate mankind so that religion and the love of God may be established afresh in the hearts of men. I have been sent like the one who came after Moses and whose spirit was taken up into the heavens during Herod's reign after much suffering". (*Fateh Islam*)

And in a lettter addressed to Hazrat Maulvi Noor-ud-Din in the year 1885 he said: "The undersigned, author of "*Braheen-i-Ahmadiyya*, has been commissioned by God to try, in the spirit of the Prophet of Nazareth, the Israelite Messiah, to regenerate mankind through perfect humility, meekness, humbleness and solicitude, and to show to those who are unaware of the right way, the straight path, by walking in which true salvation is attained and in this very world are seen the signs of heavenly life and the rays of divine acceptance and favour".

But unfortunately the people rejected him and shouted their denial and demanded for relevant scriptural evidence. He, therefore, referred to the Holy Quran and with divine help, elucidated the prophecies—1 : 7 ; 24 : 56 ; 73 : 16. He also

quoted what Jesus (peace be upon him) said to his disciples : "Ye shall not see me henceforth, till ye shall say : Blessed is he that cometh in the name of the Lord (Math". 24 : 39)

From *Bukhari* we learn that the Holy Prophet (peace be upon him) says : "How will you be when the son of Mary comes and stays with you : He will be your *Imam* from among yourselves".

Obviously the Holy Prophet (peace be upon him) did not mean the son of Mary who was put on the cross. In fact he stated clearly that the Mehdi would be "from among yourselves", i.e. he would not descend from the heavens but would appear from among the Muslims of the age.

Hence it ensues that the claim of the Promised Messiah is well founded. Moreover Ahmad of Qadian (peace be upon him) has broken the cross by refuting the doctrine of crucifixion and proving beyond doubt that Jesus died in Srinagar, Kashmir and not on the cross as was believed.

Having proved his authenticity as the Promised Messiah and Mehdi of the age, Ahmad started his world-wide reformation. His teachings did not affect the Muslim world only but, to a very great extent, made a lasting impression on the whole world. Before the advent of the Mehdi (peace be upon him) Muslims were embracing Christianity by thousands. The tenets of Islam were not observed. Muslims were always on the defensive. Moreover they used to adopt an apologetic attitude when they were attacked by the Christians. But with the advent of the Promised Messiah (peace be upon him) new life was imparted to the Muslims and consequently these same Muslims, who used to remain on the defensive, started the conquest of Christendom and others too. A redeeming feature of the age is the establishment of mosques in European countries.

Many Muslims believed in the abrogation theory about

certain portions of the Holy Quran and would have never listened to reason had the Messiah not come. He dealt a death blow to that theory by giving the correct interpretation of these verses and showing that they do not clash with each other. The peak of his achievements was that he proved Islam to be a living religion and that all other religions were dead ones.

True to that with which he had been entrusted, he has set free the human spirit from a long period of bondage to oppressive materialism and immorality. Verily, he established the superiority of the Holy Quran over all scriptures of the world. His books, which cover a very wide range of religious topics and which instil us with a new interest in the living God, have been spread in all corners of the world.

We cannot come in contact with his writings without. feeling his deep spiritual nature and absolute genuineness Every sentence which he has written is alive and speaks volumes of his purity.

However, History repeats itself. As every Prophet of God has suffered so he was persecuted and insulted by his enemies — enemies of Islam. Countless efforts were made to check the spread of his teachings. And when his enemies saw that they were unsuccessful in their attempts, they resorted once more to defamation and insults. But God had promised to help him and thus the Great Reformer and Mehdi (peace be on him) steered his ship safely amidst a multitude of human rocks.

A succession of worldly *mullahs* brought the Muslims into flagrant discord with the principles of Islam and caused a good majority of them to turn a deaf ear to the Promised Messiah (peace be upon him). Thus our Muslim brethrens were led astray like the sheep of Israel. But the Mehdi (peace be upon him) did not surrender. With renewed interest, he resolutely set to work to rally these forsaken men under his banner. He was indefatigable in his efforts to lead mankind back to the pure unity of God. He repeatedly published books and pamphlets

inviting the world to question his authenticity.

The educated classes had lost their grasp upon morality. The Islamic virtues were scorned by the foremost and ablest thinkers. They were too much with the world to pay attention to the wise words of the Promised Messiah (peace be on him).

It was due to these specific qualities and diverse circumstances that the Re-Birth of Islam took place.

In his late years he implored God to give give him a son. His prayers were heard and God promised him an illustrious son who would spread the message to all corners of the world. In fact the birth of that son was a heavenly sign and a blessing to the Promised Messigh (peace be upon him).

The Medhi has always exhibited the greatest confidence in the Almighty Allah. He covered a large number of volumes, expounding the glories of Ahmadiyat or True Islam. He confirmed, demonstrated and vindicated the truth, excellence and beauty of Islam by heavenly signs.

Thus the Reformer and Mehdi of this age came to reform this corrupted world where the inhabitants had lost all contact with their Creator, and where sanctity was not to be found. Seekers of Truth recognise him and know that he is the Champion of Islam. He is the Mehdi (peace be upon him) whom we have been waiting for. He came to light our path and to guide us.

Through our present leader, Hazrat Khalifatul Masih II, the promised son, the reformation is still going on. And we are proud to say that the number of people embracing the fold of Ahmadiyat or True Islam is increasing by leaps and bounds. Our movement has spread a network of missionaries over the world and will soon widen its scope and engulf the whole world. The reformation has been a success. And the Renaissanee has showed us that there is a Living God.

All praises belong to God only.

OUR QUIZ FEATURE

How good is your general knowledge? Answer the following questions and compare your answers with those given on the next page :

1. What is the difference between a psychologist and a Zoologist ?
2. How does the filament of the electric bulb burn without oxygen ?
3. How were the Himalayas formed ?
4. Who invented the (1) Dynamite (2) Television (3) The Gramophone (4) Income Tax ?
5. By whom were (i) ultra-violet rays (ii) Bacillus of T. B. and (iii) Vaccination discovered ?
6. Who were the first mountaineers to reach the top of Mount Everest ?
7. Who are known as the greatest poets in the following languages : (a) Bengali (b) German (c) Persian ?
8. Why does the sun appear bigger at the time of rising and setting ?
9. Who were Amerigo Vespucci and Christopher Columbus ?
10. What is the difference between a Hurricane and a Typhoon ?

ANSWERS TO OUR QUIZ FEATURE

1. The psychologist and Zoologist study man and the lower animals but the psychologist tends to emphasise their minds and behaviour while the zoologist their structure and functions.
2. The filament of the electric bulb does not burn but glows. Hence it requires a vacuum rather than oxygen.
3. The Himalayas were formed by violent crumbling of the crust of the earth along the southern margin of the great table-land of central Asia.
4. (1) Dr. Alfred Bernhard Nobel (2) John L. Baird (3) E. Berliner (4) Marquis de Vauban.
5. (i) William Hyde Wollaston (ii) Robert Koch (iii) Edward Jenner.
6. Sherpa Tensing and Sir Edmund Hillary.
7. Bengali——Rabindranath Tagore and Nazrul Islam.
   German——Goethe
   Persian——Saadi.
8. When the sun rises or sets, the degree of refraction of sun's rays as they pass through the atmosphere is greater than at any other time of the day. It is on account of the refraction that the sun appears greater at the time of rising and setting.
9. Amerigo Vespucci gave his name to the land discovered by Columbus. It was named Americi Terra and is known as America to-day. Christopher Columbus discovered America in the year 1492. A.D.
10. Hurricane and typhoon are two tropical storms that begin in the oceans near the equator. i.e. in all the oceans except south Atlantic. Storms in West Indies are known as hurricanes. In China sea and in the East Indies they are known as typhoons whereas in the Indian ocean they are called cyclones.

Ijaz-ul-Haq Qureshi B.A. Hons.

ISLAMIC CONCEPT OF NATIONALISM

Islam emerged on the surface of Arabia when the whole world was immersed in utter spiritual and social consternation. Of its manifold objects, one was to cast aside the segregations of cast and creed and integrate different racial units into one Islamic entity. It declared that all those who entered the fold of Islam became equal in status. All the Muslims, it was asserted, constituted one nation—religion being upheld as the basis of nationality and not racial unity. By his personal example, the Holy Prophet (peace and blessings of God be upon him) proved to the world that *Ansars* and *Muhajireen* were one nation, in spite of the fact that they belonged to different tribes; whereas the *Muhajireen* and Abu Jahal's companions were not, although both of them belonged to the same line—the Quraish. Thus according to Islamic tenets, all the Muslims wherever they may be living and to whatever race they may belong are one nation.

Before putting forth the conception of Islam about nationalism, it is desirable to discuss the modern views about the subject in order to form a correct appraisal of Islamic views. Nationalism is at times used to describe an exaggerated sentiment of nationality bordering on aggressiveness. "In Europe," says Zimmern, "Nationality is an instinct which has been stung into morbid and acute self-consciousness by political oppression." Rabindarnath Tagore, in his essay on Nationalism, condemns "oppressive kind of nationalism." He called it the organized self-interest of a whole people; self-idolatory; the organization of politics and selfish ends; an organized power for exploitation. Nationalism, some say, so

embitters relations between countries that a systematic study of one another's culture and civilization becomes impossible. Hayes condemns that form of nationalism which is a "proud and boastful habit of mind about one's own nation accompanied by a supercilious or hostile attitude towards the nation."

The above-mentioned aggressive kind of nationalism which is aptly described as 'wolf pack' nationalism is the breeder of war as in case of Japan, Fascist Italy and Nazi Germany. Economic nationalism known as 'Autarchy' in its extreme form, some modernists point out, aims at complete self-sufficiency. Past years, they say, have witnessed the spectacle of wheat burnt in Canada, apples and milk being dumped in rivers in the United States and coffee being thrown into the sea in Brazil while millions were starving. So nationalism, some remark, is a curse.

Now let us consider what Islam advocates. Islam is a peaceful religion. It prevents its adherents from territorial aggrandisement. History furnishes ample evidence to the fact that early Muslims, who strictly followed the tenets of Islam, fought against others only when they were too much oppressed and the enemy took the offensive. Thus God says in the Holy Quran :

> *"Will ye not fight a people who have violated their oaths and resolved the expulsion of the apostle and who began against you for the first time? (9 : 13)*

In the days of pious caliphs also, this principle was strictly followed and the charge laid by the European writers that the Muslims fought for territorial aggrandisement is false. Never did the Muslims fight for personal avarice. The caliph Umar once said that he wished there were a mountain of fire between the dominions of Muslims and that of Byzantines and Persians so that they might not enter the latter's territories. In the light of this, it becomes crystal-clear that the Muslims are to follow the path of war only

in case of extreme urgency, otherwise they remain peaceful. Islam teaches that the Muslims should not let loose their national sentiments for undue encroachment upon others' dominions. It permits only redemptive kind of nationalism whose motto is to 'live and let live'. It strongly condemns 'patriotic snobbery'; jingoism—pure and simple. It imparts such a kind of national education which, if rightly used, can serve the necessary purpose of creating a moral unity, a common understanding of right and wrong, a community of ideas in most matters and social intercourse amongst all the members of a nationality.

Since the 19th century, the word 'nationalism' has been used to mean 'attainment of political independence.' There has been much awakening in the Muslim world especially in the Midle East, Far East and Africa in the present century. Most of the Muslims of these countries have got rid of foreign yoke and achieved the right of self-determination. This sort of struggle is lawful because they have regained their own lost inheritance from colonial powers. But if after gaining independence, they go on adopting an undue hostile attitude against other countries, that would be un-Islamic.

So far we have dealt with political aspects of nationalism; now we take the economic side. Islam teaches the Muslims to have sympathetic feeling for mankind and does not allow economic ruination of other nations at the cost of their own good. For instance, the Quraish of Mecca were the bitterest enemies of the Holy Prophet and Islam in the beginning and the Holy Prophet was right in uprooting them by any means he wished. Let us see his treatment to them. The city of Mecca was not self-sufficient economically and usually food-grains were imported from Yemen to meet the local requirements. After the 'Battle of Trench', Thumama bin Uthal (ثمامہ بن اثال), a chief of Yemen, accepted Islam and stopped sending grains to Mecca in order to paralyse the Quraish

economically. The result was utter starvation and the Quraish requested the Holy Prophet not to stop the food-grains. Here is a point to consider! The Holy Prophet could, if he chose, continue the economic blockade and thus bring about the annihilation of his worst enemies. But he did not do so, for Islam being a religion of tolerance admonishes good treatment even to non-Muslims. The Holy Prophet ordered Thumama to revive sending food-grains to Mecca. What a noble treatment! Thus it is manifest that unlike modern nationalists, who base their nationalism on disregard of others, Islam does not allow autarchy. On the other hand, Islam exhorts to assist the distressed even if he may not be a Muslim. Thus if a country has fallen on evil days but does not carry aggressive designs on Muslims it is incumbent on the latter to retrieve that out of economic impasse rather than uproot that.

Now let us take the social and cultural aspect. Islam does not teach the Muslims to abhor altogether the ways and ideas of other nations even if they may be good. On the contrary, it enunciates that the Muslims should assimilate good wherever it may be and say that in reality it was their possession which they had lost. Thus mutual understanding and cross-fertilization of culture which can go a long way to the advancement of nations is possible within Islam.

To put it all in a nut-shell, Islam being a perfect religion presents true form of nationalism which is free from malice to others. It does not allow such form of nationalism which adheres only to particular territorial units because Islam is a world-wide religion meant for all humanity. Patriotism with strong national sentiment for only a specific region is foreign to Islam and, according to Allama Iqbal, it amounts to '*kufr*' renunciation of Islam. True form of Nationalism in Islam means noble sentiment for the whole

Islamic community spread over the world rather than provocation of any sort. Moreover, taking into consideration the general injunctions of God concerning noble treatment even to non-Muslims, we can safely say that Islam advocates international peace as well.

In order to avoid the sequence suggested by Franz Grillpazer : 'From Humanity through Nationality to Bestiality' it is necessary for the nations of the world to develop an international mind and active friendship and goodwill. Nationalism, as interpreted under Islamic views, is not a curse. Hayes opines : "Nationalism when it becomes synonymous with the purest patriotism will prove a unique blessing to humanity and to the world." If the mankind is to guard itself from the catastrophe which awaits it, it should replace national exclusiveness by international inclusiveness.

'Hence peace be within thy walls and prosperity within thy palace!'

Essay Competition

The announcement of the topic for the 1964 Almanar contest is being made earlier so as to give students, who intend to participate, more time to prepare their essays.

Prizes of Rs. 15, Rs. 10 and Rs. 5 will be awarded for the first three winning essays.

Winners of the contest will be announced in the next issue of Almanar.

Topic: "Religion and Society."

Rules: 1. The contest is open to all the students of T.I. College.

2. Essays must be written in English and should not be copied from any book or magazine.
3. Essays must be limited to a maximum of 1500 words. (Please count the words and indicate the actual count at the top right-hand corner of the first page.)
4. The contest will close on the 15th of March, 1964.
5. All entries become the property of Almanar and cannot be returned. Winning entries will be published in the Almanar.
6. The decision of the board of judges will be final.
7. The essays must be addressed to:

"CONTEST EDITOR - ALMANAR"

The ex-students of the college are allowed to participate but no prize will be awarded to them.